

مشرق

کہانی میگزین

22 تا 28 نومبر 2026ء

ٹرمپ شی جن پنگ اور پوتن کی شینزن ملاقات
تاریخی موقع، مشترکہ اعلامیہ اور عالمی تناظر

بلاول بھٹو کا سخت جواب، کراچی کی سڑکوں پر خون بہے گا؟
محسن نقوی کی ریفرنڈم کی تجویز، ملک میں نئے صوبوں کی بحث

سپر ایل نینو 27-2026 کا موسمی بحران

زمین سے ایک نوری دن کا فاصلہ مکمل کرنے والا جہاز
جس میں خلائی مخلوق کے لیے اردو میں بھی پیغام ہے



ساجد خان
(لاہور بیورو)

ٹرمپ شی جن پنگ اور پوتن کی شینزن ملاقات

تاریخی موقع، مشترکہ اعلامیہ اور عالمی تناظر



چین کے شہر شینزن میں ایشیا پیسیفک اقتصادی تعاون فورم (اے پی ای سی) کے موقع پر چینی صدر شی جن پنگ، روسی صدر ولادیمیر پوتن اور امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے درمیان ہونے والی سہ فریقی ملاقات نے بین الاقوامی سیاست میں ایک غیر معمولی لمحہ پیدا کیا۔ چینی سرکاری میڈیا کے مطابق شی جن پنگ نے اس ملاقات کو مثبت، تعمیری اور انتہائی نتیجہ خیز قرار دیا۔ تینوں رہنماؤں نے اسٹریٹجک استحکام، بین الاقوامی سلامتی، توانائی کے تحفظ، جوہری عدم پھیلاؤ اور کچھ بین الاقوامی اداروں کے دائرہ اختیار جیسے موضوعات پر بات کی اور بعد میں ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا۔

ملاقات کے آغاز پر شی جن پنگ نے اسے تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا اجلاس قرار دیا جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ تینوں ممالک کو عالمی چیلنجز سے نمٹنے کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے اور دنیا کے باقی ممالک کے لیے مثال قائم کرنی چاہیے۔ ٹرمپ نے اس موقف کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ سہ فریقی اجلاس واقعی تاریخ رقم کر رہا ہے اور تینوں رہنماؤں پر نتیجہ خیز مکالمے کو برقرار رکھنے کی خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مذاکرات اور رابطوں کے مواقع کو مسترد کر کے کبھی امن قائم نہیں کیا گیا۔ پوتن نے بھی بین الاقوامی امن کے تحفظ میں تینوں ممالک کی ذمہ داری پر زور دیا اور کہا کہ روس، چین اور امریکہ اگر تعمیری تعاون کریں تو عالمی استحکام کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ چینی سرکاری نشریاتی ادارے سی سی ٹی وی کے مطابق شی جن پنگ نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران شانہ بشانہ لڑنے کی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے امن کی قدر و اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ بڑی طاقتوں کو سلامتی کے حوالے سے تمام ممالک کے جائز خدشات کا احترام کرنا چاہیے۔ جب تک مکالمہ جاری رہے گا اور دروازہ کھلا رہے گا، امن کی امید برقرار رہے گی۔ مشترکہ اعلامیے میں کہا گیا کہ تینوں رہنما اسٹریٹجک استحکام اور بین الاقوامی سلامتی کے تحفظ کے لیے اپنے عزم پر قائم ہیں۔ توانائی کے تحفظ سے متعلق امور پر تبادلہ خیال ہوا اور ریفائن شدہ پیٹرولیم مصنوعات کی پیداوار اور فراہمی بڑھانے کے منصوبوں پر اتفاق کیا گیا۔



ریاستی عہدیداروں کو حاصل استثنیٰ کا معاملہ بھی زیرِ بحث آیا۔

اعلامیے میں کہا گیا کہ بین الاقوامی فوجداری عدالت (آئی سی سی) اور اس نوعیت کے دیگر اداروں کو اپنے دائرہ اختیار کا ناجائز استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ جوہری امور پر تینوں رہنماؤں نے اس موقف کا اعادہ کیا کہ جوہری جنگ جیتی نہیں جا سکتی اور اسے کبھی لڑا نہیں جانا چاہیے۔ جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے باہمی مذاکرات کا عمل جاری ہے۔ چینی سرکاری میڈیا کے مطابق ملاقات کے آغاز میں شی جن پنگ نے جوہری ہتھیاروں کو انسانیت کے سر پر لٹکتی ڈیموکلیز کی تلوار قرار دیا تھا اور کہا کہ انہیں مکمل طور پر ممنوع قرار دیا جانا چاہیے اور مکمل طور پر تباہ کر دینا چاہیے۔ قدیم یونانی کہانی میں ڈیموکلیز کی تلوار بڑی طاقت یا دولت کیساتھ جڑے مستقل خطرات کے استعارے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ملاقات کے بعد کریملن نے ایک ویڈیو جاری کی جس میں پوتن کو اجلاس کے مقام سے روانہ ہوتے اور شی جن پنگ کو الوداع کہتے ہوئے دکھایا گیا۔ پوتن نے شی سے کہا کہ اس ملاقات کے انعقاد کے لیے شکریہ اور میرا خیال ہے کہ کسی نے بھی توقع نہیں کی تھی کہ سب کچھ اتنا اچھا ہوگا۔

یوکرین جنگ کے حوالے سے پوتن نے دعویٰ کیا کہ کیف اور یورپی ممالک ابھی تک تنازع کے حل کے لیے سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ولادیمیر پوتن نے روس اور مقبوضہ کریمیا کو ملانے والے پل پر حالیہ حملوں کے حوالے سے کہا کہ سہ فریقی مذاکرات سے قبل اس پر ایک بار پھر حملہ کیا گیا تھا۔ میڈیا سے گفتگو میں پوتن نے کہا کہ انھوں نے روسی کنٹرول والے متعدد علاقوں میں ممکنہ جنگ بندی پر تبادلہ خیال کیا تھا، تاہم پل پر بار بار ہونے والے حملوں کے بعد مذاکرات آگے نہیں بڑھ سکتے۔ روسی صدر نے کہا: 'ہم اس پل کو فوجی ساز و سامان یا دیگر فوجی سامان کی نقل و حمل کے لیے استعمال نہیں کرتے، حتیٰ کہ تیل اور تیل کی مصنوعات کی ترسیل کے لیے بھی نہیں۔ یہ مکمل طور پر ایک سویلین تنصیب ہے۔' روسی صدر نے خبردار کیا کہ روس ان حملوں کا جواب دے گا اور کہا کہ 'ہمارے جوابی اقدامات کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوں گے۔'

روسی خبر رساں ایجنسی ریانوستی کے مطابق پوتن نے یہ بھی کہا کہ انھیں یقین ہے کہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ واقعی یوکرین تنازع کے حل اور روس اور امریکہ کے درمیان تعلقات کی بحالی کے خواہاں ہیں۔ پوتن نے کہا ہے کہ سہ فریقی ملاقات میں اقوام متحدہ میں اصلاحات، سکیورٹی کے امور اور جوہری عدم پھیلاؤ سمیت متعدد اہم موضوعات پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے روسی صدر



نے کہا کہ جوہری شعبے میں روس کو برتری حاصل ہے کیونکہ ان کے بقول روس جوہری ٹیکنالوجی اور جوہری توانائی کے پُرامن استعمال میں عالمی رہنماؤں میں شمار ہوتا ہے۔ روس اور امریکہ کے تعلقات کے بارے میں پوتن نے کہا کہ دونوں ممالک کے تعلقات میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ تاہم ان کا کہنا تھا کہ ماسکو کے حوالے سے ٹرمپ انتظامیہ کا طرزِ عمل امید افزا محسوس ہوتا ہے۔ روسی صدر ولادیمیر پوتن نے چین، امریکہ اور روس کے درمیان ہونے والی سہ فریقی ملاقات کو 'سفارتی تاریخ کا ایک اہم باب' قرار دیا۔ میڈیا سے گفتگو میں پوتن نے کہا کہ کئی اہم معاملات پر تینوں رہنماؤں کے درمیان اگر مکمل اتفاق رائے نہیں بھی ہوا تو کم از کم باہمی سمجھ بوجھ ضرور پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملاقات کے دوران بات چیت مکمل طور پر کھلے ماحول میں ہوئی، جس سے رہنماؤں کو ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملی۔

روسی میڈیا نے رپورٹ کیا کہ مشترکہ اعلامیہ ایک گھنٹے کے اندر جاری کیا جائے گا۔ اجلاس کے اختتام کے بعد ٹرمپ ایئر فورس ون میں سوار ہو گئے جبکہ پوتن بھی روانہ ہو گئے۔ یوکرین جنگ کے حوالے سے پوتن نے میڈیا سے گفتگو میں دعویٰ کیا کہ کیف اور یورپی ممالک ابھی تک تنازع کے حل کے لیے سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہیں۔ انہوں نے روس اور مقبوضہ کریمیا کو ملانے والے پل پر حالیہ حملوں کا ذکر کیا اور کہا کہ سہ فریقی مذاکرات سے قبل اس پر ایک بار پھر حملہ کیا گیا تھا۔ پوتن نے کہا کہ انہوں نے روسی کنٹرول والے متعدد علاقوں میں ممکنہ جنگ بندی پر تبادلہ خیال کیا تھا تاہم پل پر بار بار ہونے والے حملوں کے بعد مذاکرات آگے نہیں بڑھ سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس پل کو فوجی ساز و سامان یا دیگر فوجی سامان کی نقل و حمل کے لیے استعمال نہیں کرتے، حتیٰ کہ تیل اور تیل کی مصنوعات کی ترسیل کے لیے بھی نہیں۔ یہ مکمل طور پر ایک سویلین تنصیب ہے۔ پوتن نے خبردار کیا کہ روس ان حملوں کا جواب دے گا اور ہمارے جوابی اقدامات کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ ٹرمپ واقعی یوکرین تنازع کے حل اور روس اور امریکہ کے درمیان تعلقات کی بحالی کے خواہاں ہیں۔ ملاقات میں اقوام متحدہ میں اصلاحات، سکیورٹی کے امور اور جوہری عدم پھیلاؤ سمیت متعدد اہم موضوعات پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ جوہری شعبے میں روس کو برتری حاصل ہے کیونکہ روس جوہری ٹیکنالوجی اور جوہری توانائی کے پرامن استعمال میں عالمی رہنماؤں میں شمار ہوتا ہے۔ پوتن نے ملاقات کو سفارتی تاریخ کا ایک اہم باب قرار دیا اور کہا کہ کئی اہم معاملات پر تینوں رہنماؤں کے درمیان اگر مکمل اتفاق رائے نہیں بھی ہوا تو کم از کم باہمی سمجھ بوجھ ضرور پیدا ہوئی۔ بات چیت مکمل طور پر کھلے ماحول میں ہوئی جس سے رہنماؤں کو ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملی۔ اس





ملاقات کی اہمیت اور یورپ کی تشویش تاریخی سیاق و سباق سے جڑی ہوئی ہے۔ بہت سے حلقوں نے اسے سنہ 1945 کی یالٹا کانفرنس کی یاد دلا دی جہاں دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا کی نئی ترتیب طے کرنے کے لیے برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل، امریکی صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ اور سوویت رہنما جوزف سٹالن جمع ہوئے تھے۔ یالٹا میں مشرقی یورپ میں سوویت اثر و رسوخ بڑھانے پر اتفاق ہوا اور مشرقی ایشیا سے متعلق خفیہ معاہدے بھی طے پائے۔ اس کے بعد مشرقی یورپ میں یالٹا کی اصطلاح بڑی طاقتوں کے درمیان ایسے معاہدے کے لیے استعمال ہونے لگی جس میں دنیا کو اثر و رسوخ کے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور چھوٹے ممالک کے مفادات کو نظر انداز کیا جائے۔ یوکرین کے صدر ولادیمیر زیلنسکی نے کہا کہ وہ نہیں چاہتے کہ یہ ملاقات یالٹا ٹو، تھری یا فور بن جائے جہاں صرف دنیا میں اثر و رسوخ کے حصے بانٹنے پر بات ہو۔ جرمن چانسلر نے کہا کہ یوکرین میں جنگ کے خاتمے سے متعلق کسی بھی بات چیت میں یورپ کی شمولیت ضروری ہے اور امن معاہدے کے اہم معاملات یورپی ممالک کی شرکت کے بغیر طے نہیں کیے جا سکتے۔ ماہرین کے مطابق روس کے لیے اس طرح کی ملاقات کا مقصد واضح ہے کہ یوکرین جنگ کے معاملے پر ہونے والی بات چیت میں یورپ کو شامل نہ کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ روس کو عالمی سطح پر تنہا نہیں کیا جا سکتا۔ ٹرمپ کے لیے یہ ایک بڑی اور غیر معمولی تقریب تھی جس سے وہ دنیا کی بڑی طاقتوں کے رہنماؤں کو ایک میز پر جمع کرنے کا سہرا اپنے سر باندھ سکیں۔ چین کے لیے فوائد اتنے واضح نہیں تھے کیونکہ یالٹا کانفرنس چین کے لیے کوئی اچھی یاد نہیں تھی جب سوویت یونین نے منچوریا میں خصوصی مفادات حاصل کیے تھے۔ تاہم ملاقات نے شی جن پنگ کو ایک ایسے عالمی رہنما کے طور پر سامنے لانے میں مدد دی جن سے ملاقات کے لیے دنیا کی دوسری بڑی طاقتوں کے سربراہ خود چین آتے ہیں۔ استقبال کے فرق پر بھی بحث ہوئی۔ ٹرمپ کے چین پہنچنے پر شی جن پنگ خود ہوائی اڈے پر موجود تھے اور گلے ملے جبکہ پوتن کے استقبال کی ذمہ داری ایک سینئر چینی اہلکار نے نبھائی تھی۔ بعض مبصرین نے اسے اشارہ قرار دیا کہ چین امریکہ کے ساتھ تعلقات کو سنبھالنے میں سنجیدہ ہے تاہم ماہرین کا کہنا ہے کہ اس سے چین اور روس کے تعلقات پر منفی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ چین کو دونوں کی ضرورت ہے لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر۔ مجموعی طور پر ملاقات نے ٹھوس پیش رفت سے زیادہ علامتی اہمیت حاصل کی۔ مشترکہ اعلامیہ زیادہ تر عمومی حمایت پر مبنی تھا اور یوکرین جنگ یا دیگر تنازعات پر تفصیلی حل پیش نہیں کرتا۔ تاہم تین بڑی طاقتوں کے رہنماؤں کا ایک میز پر بیٹھنا خود ایک پیغام تھا کہ مکالمہ جاری رکھنا ممکن ہے۔ پوتن نے ملاقات کو اچھا قرار دیا، شی نے اسے نتیجہ خیز بتایا اور ٹرمپ نے تاریخ رقم کرنے کا دعویٰ کیا۔ یورپ اور یوکرین کی تشویش برقرار رہی کہ چھوٹے ممالک کے مفادات نظر انداز نہ ہوں۔ یہ ملاقات عالمی نظام کی تبدیلی کے بحث میں ایک نیا باب کھولتی ہے۔ بڑی طاقتیں جب اکٹھی ہوتی ہیں تو امید اور خدشے دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ امن کی امید تب ہی مضبوط ہوتی ہے جب مکالمہ صرف بڑی طاقتوں تک محدود نہ رہے بلکہ تمام متعلقہ فریقوں کی شرکت یقینی بنائی جائے۔ شینزن کی یہ ملاقات اسی تناؤ کو سامنے لاتی ہے جو آج کی بین الاقوامی سیاست کی پہچان بن چکا ہے۔

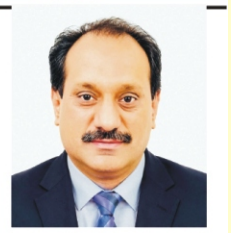

مقصود خالد
بیورو چیف لاہور

دنیا کی 500 بااثر مسلم شخصیات میں پاکستان کے 28 نام



رپورٹ میں فیلڈ مارشل عاصم منیر کے کیریئر کے اہم پہلوؤں میں ملٹری انٹیلیجنس اور انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کے محکموں کی سربراہی، 2025 کی انڈیا۔ پاکستان کشیدگی کے دوران کردار اور سعودی عرب و ترکی کے ساتھ مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے میں شمولیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

دنیا کی بااثر شخصیات کی فہرستیں محض ناموں کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ اس بات کی عکاسی بھی کرتی ہیں کہ عالمی سطح پر کن افراد کی فکری، سیاسی، مذہبی، سماجی، علمی اور معاشی سرگرمیوں کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ مسلم دنیا کی بااثر شخصیات کے حوالے سے ہر سال جاری ہونے والی اشاعت ''دی مسلم 500'' بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کوشش ہے۔ یہ فہرست اردن کے دارالحکومت عمان میں قائم ادارہ رائل اسلامک سٹریٹیجک سٹڈیز سینٹر (آر آئی ایس ایس سی) ہر سال 'دی مسلم 500' کے نام سے شائع کرتا ہے، جس میں اُن مسلم شخصیات کو شامل کیا جاتا ہے جنھیں مسلم دنیا میں سب سے زیادہ بااثر سمجھا جاتا ہے۔ ادارے کے مطابق 2027 کی فہرست میں پہلی بار پانچ شخصیات کو مشترکہ طور پر پہلا نمبر دیا گیا ہے۔ سرکاری انڈیکس کے مطابق پاکستان سے تعلق رکھنے والی 28 شخصیات اس اشاعت میں شامل ہیں، جن کا تعلق سیاست، مذہبی رہنمائی، تعلیم، تحقیق، صحافت، فنون، سماجی خدمات اور دیگر شعبوں سے ہے۔

اس فہرست میں ان کے ساتھ سعودی عرب کے بادشاہ سلمان بن عبدالعزیز، ولی عہد محمد بن سلمان اور ترکی کے صدر رجب طیب اردوغان بھی شامل ہیں۔ فہرست میں سابق وزیراعظم عمران خان بھی شامل ہیں، یہ پہلی مرتبہ ہے کہ اس اشاعت میں پانچ پاکستانی شخصیات مشترکہ طور پر شامل قرار دی گئی ہیں۔ اس فیصلے کو پاکستان، سعودی عرب اور ترکیے کے درمیان دفاعی تعاون اور مشترکہ دفاعی معاہدے کے تناظر میں بھی دیکھا گیا ہے۔ 'آر آئی ایس ایس سی' کا کہنا ہے کہ اس فیصلے کی بنیادی وجہ مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ ہے، جس پر سات اگست 2026 کو دستخط کیے گئے تھے۔ ادارے کی جاری کردہ رپورٹ کے مطابق یہ معاہدہ سعودی عرب کے مالی وسائل، ترکی کی ٹیکنالوجی اور صنعتی صلاحیت، اور پاکستان کی فوجی طاقت کو ایک اتحاد کی صورت میں یکجا کرتا ہے۔ اشاعت میں کہا گیا ہے کہ 'ایک سب کے لیے اور سب ایک کے لیے' کے اصول پر مبنی اس دفاعی تعاون نے خطے کی سیاست پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔

اس فہرست سے منسلک رپورٹ میں وزیرِ اعظم شہباز شریف اور مسلح افواج کے سربراہ عاصم منیر کے بارے میں الگ الگ جائزے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ شہباز شریف کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ وہ پاکستان کے 24 ویں وزیراعظم ہیں اور مارچ 2024 میں دوسری بار اس عہدے پر فائز ہوئے۔ رپورٹ میں انھیں محنتی اور سخت گیر منتظم قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی حکومت کے دوران پاکستان نے معاشی بحران اور دیوالیہ ہونے کے خطرات سے نکل کر معاشی استحکام کی جانب پیش رفت کی۔ رپورٹ کے مطابق معاشی اشاریوں میں بہتری آئی، مہنگائی میں کمی ہوئی اور زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ ہوا۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وزیراعظم شہباز شریف نے سعودی عرب اور ترکی کے رہنماؤں کے ساتھ مل کر مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے پر دستخط کیے، جسے مسلم دنیا میں دفاعی تعاون کے ایک اہم اقدام کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ رپورٹ میں ان کا کردار مشرقِ وسطیٰ میں ثالثی کی کوششوں، خصوصاً ایران، امریکہ اور اسرائیل سے متعلق بحران میں پاکستان کو ایک غیر جانب دار ثالث کے طور پر پیش کرنے کے تناظر میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ تاہم رپورٹ میں یہ بھی ذکر ہے کہ شہباز شریف کو اندرونِ ملک معاشی مشکلات، مہنگائی، قرضوں کے بوجھ، سیاسی کشیدگی اور جیل میں قید سابق وزیراعظم عمران خان کی مقبولیت سے جڑے چیلنجز کا سامنا ہے۔

فیلڈ مارشل عاصم منیر کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ وہ پاکستان کے چیف آف ڈیفنس فورسز اور چیف آف آرمی سٹاف ہیں اور دنیا کی چھٹی بڑی فوج کی کمان سنبھالے ہوئے ہیں۔ اشاعت کے مطابق مئی 2025 میں فیلڈ مارشل کے عہدے پر ترقی کے بعد ان کا 'سیاسی، عسکری اور آئینی' اثر و رسوخ مزید بڑھا۔ رپورٹ میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ پاکستان کی تاریخ کے پہلے آرمی چیف ہیں جو حافظِ قرآن ہیں۔ رپورٹ میں ان کے کیریئر کے اہم پہلوؤں میں ملٹری انٹیلیجنس اور انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کے محکموں کی سربراہی، 2025 کی انڈیا۔ پاکستان کشیدگی کے دوران کردار اور سعودی عرب و ترکی کے ساتھ مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے میں شمولیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اشاعت کے مطابق فیلڈ مارشل عاصم منیر کی پسِ پردہ سفارت کاری نے امریکہ اور ایران کے درمیان ثالثی کو ممکن بنایا، جس کے نتیجے میں خطے میں عارضی جنگ بندی ہوئی۔ اس کردار پر انھیں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے بھی کھلے الفاظ میں سراہا گیا۔ رپورٹ میں فیلڈ مارشل عاصم منیر کے اندرونِ ملک کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ انھوں نے قومی نظم و ضبط کے حوالے سے سخت مؤقف اختیار کرتے ہوئے سیاسی اور معاشی معاملات میں استحکام برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

رپورٹ میں پاکستان سے دیگر نمایاں شخصیات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔



''فہرست میں معروف مذہبی سکالر تقی عثمانی ساتویں، مبلغ مولانا طارق جمیل 32 ویں، تبلیغی جماعت سے وابستہ مولانا نذر الرحمٰن 41 ویں اور دعوتِ اسلامی کے بانی محمد الیاس عطار قادری 44 ویں نمبر پر شامل ہیں۔ میڈیا کے زمرے میں پاکستان کے صحافی حامد میر، اور ٹیلی وژن چینل اے آر وائی کے مالک سلمان اقبال کا نام بھی شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح جماعت اسلامی پاکستان کے امیر حافظ نعیم الرحمٰن، ادارہ منہاج القرآن کے بانی طاہر القادری، تعلیم کے لیے کام کرنے والی نوبیل انعام یافتہ کارکن ملالہ یوسفزئی، ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل گورننس کے شعبے سے وابستہ ڈاکٹر عمر سیف، ماہرِ طبیعیات پروفیسر عرفان صدیقی سمیت متعدد پاکستانی نام مختلف زمروں میں شامل ہیں۔ عالمی شخصیات میں مشترکہ پہلے نمبر پر سعودی، پاکستانی اور ترک قیادت کے بعد فہرست میں ایران کے رہبرِ اعلیٰ آیت اللہ علی خامنہ ای، قطر کے امیر شیخ تمیم بن حمد آل ثانی، مراکش کے بادشاہ محمد ششم، اردن کے بادشاہ عبداللہ دوم اور عمان کے سلطان ہیثم بن طارق بھی شامل ہیں۔ افغانستان کے طالبان رہنما ملا ہبیت اللہ اخوندزادہ اس فہرست میں 19 ویں نمبر پر شامل ہیں۔ اسی فہرست میں لندن کے میئر صادق خان، نیو یارک کے میئر ظہران ممدانی اور فلسطینی تنظیم حماس کے رہنما خلیل الحیہ بھی شامل ہیں۔

بااثر مسلم شخصیات کا انتخاب کن بنیادوں پر کیا جاتا ہے؟

رپورٹ میں اس فیصلے کی وضاحت کے ساتھ فہرست مرتب کرنے کے طریقہ کار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ رائل اسلامک سٹریٹیجک سٹڈیز سینٹر نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس فہرست میں اُن افراد کو شامل کیا جاتا ہے جنھوں نے مسلم معاشروں پر نمایاں اثر ڈالا ہو یا اُن کے لیے اہم خدمات انجام دی ہوں اور یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ فہرست مرتب کرتے وقت 'اثر و رسوخ' سے کیا مراد لی جاتی ہے۔

ادارے کے مطابق اس سے مراد کسی شخص کی وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے وہ ثقافتی، نظریاتی، مالی، سیاسی یا کسی اور سطح پر مسلم دنیا یا مسلمانوں پر نمایاں اثر ڈال سکے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ اثرات مختلف زاویہ نظر سے مثبت یا منفی بھی سمجھے جا سکتے ہیں، تاہم فہرست مرتب کرتے وقت اصل معیار کسی شخصیت کا اثر و رسوخ ہے، نہ کہ اس کے بارے میں مثبت یا منفی رائے۔ ساتھ ہی اشاعت میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ فہرست میں کسی شخصیت کی شمولیت کا مطلب اس کے خیالات یا مؤقف کی تائید نہیں ہے۔

رپورٹ کے مطابق کسی شخصیت کے اثر و رسوخ کا اندازہ صرف عددی پیمانوں، مثلاً اس کے پیروکاروں (فالوورز) یا کتابوں کی تعداد، یا مقبولیت سے نہیں لگایا جاتا، بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس نے وقت کے ساتھ لوگوں اور معاشرے پر کتنا اور کیسا اثر ڈالا ہے۔ اسی لیے وقتی شہرت کے مقابلے میں دیرپا اثرات اور زندگی بھر کی خدمات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ فہرست کی تیاری میں سماجی اشاریوں، عوامی رائے اور ماہرین کی آرا کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ادارہ ہر سال ایک ماہ تک عوام سے نامزدگیاں بھی طلب کرتا ہے اور موصول ہونے والی تجاویز کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اشاعت کے مطابق کسی شخصیت کی حالیہ سرگرمیوں کے مقابلے میں زندگی بھر کی خدمات اور اثرات کو زیادہ وزن دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے افراد کو بھی اہمیت دی جاتی ہے جنھوں نے اپنے شعبوں میں نئی راہیں کھولی ہوں یا جو کسی دور دراز علاقے میں نمایاں اثر و رسوخ رکھتے ہوں۔

ادارے نے شخصیات کو 13 شعبوں (زمروں) میں تقسیم کیا ہے جن میں مذہبی علوم، سیاست، مذہبی امور کی انتظامیہ، مبلغین و روحانی رہنما، فلاحی خدمات، سماجی مسائل، کاروبار، سائنس و ٹیکنالوجی، فن و ثقافت، میڈیا، کھیل، اور انتہا پسند گروہ شامل ہیں۔ مگر ہر سال اس فہرست پر تنقید بھی ہوتی رہی ہے اور بعض ناموں کی شمولیت متنازع ہو جاتی ہے۔ مثلاً اخبار گارڈین کی 2009 کی ایک تحریر میں لکھا گیا تھا کہ 'ٹاپ 50 میں شامل بہت سے افراد یا تو سربراہانِ مملکت ہیں، جس کی وجہ سے اثر و رسوخ کے حوالے سے انھیں خود بخود برتری حاصل ہو جاتی ہے، یا پھر وہ ایسے مناصب پر فائز ہیں جو انھیں وراثت میں ملے ہیں۔'

عالمی سطح پر اثر و رسوخ اور پاکستان کی شناخت

پاکستان کے لیے اصل اہمیت یہ ہے کہ ہماری شخصیات عالمی سطح پر مختلف شعبوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔ تاہم ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہماری شخصیات صرف شہرت یا نام تک محدود نہ رہیں بلکہ علمی، تحقیقی، معاشی، سماجی اور سیاسی اصلاحات میں بھی اپنا کردار ادا کریں۔ آج ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کسی ملک کی اصل طاقت صرف اس کے حکمرانوں، فوجی قوت یا قدرتی وسائل میں نہیں ہوتی، بلکہ اس کے اہلِ علم، مفکرین، سائنس دانوں، دانش وروں، اساتذہ، سماجی کارکنوں اور باکردار رہنماؤں میں بھی ہوتی ہے۔ دنیا کی 500 بااثر مسلم شخصیات میں پاکستان کے 28 نام اس بات کی یاد دہانی ہیں کہ ہمارے ہاں صلاحیتوں کی کمی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان صلاحیتوں کو علمی تحقیق، نئی ٹیکنالوجی، عالمی روابط اور قومی ترقی کے لیے بھرپور انداز میں بروئے کار لایا جائے۔ یہ کامیابی اسی وقت حقیقی معنوں میں فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے جب ہماری شخصیات اپنے کردار اور خدمات سے آنے والی نسلوں کے لیے بھی مثال قائم کریں۔

بلاول بھٹو کا سخت جواب ’کراچی کی سڑکوں پر خون بہے گا؟‘

محسن نقوی کی ریفرنڈم کی تجویز، ملک میں نئے صوبوں کی بحث



معظم خان

پاکستان کی سیاسی فضا ایک بار پھر نئے صوبوں کے قیام کی بحث سے گونج رہی ہے۔ اس بحث نے نہ صرف حکومتی اتحاد کے اندر دراڑیں پیدا کی ہیں بلکہ صوبائی حساسیتوں، آئینی تقاضوں اور عوامی رائے کے درمیان ایک پیچیدہ توازن کو بھی سامنے لا دیا ہے۔ خاص طور پر سندھ کی تقسیم کے امکان نے اس بحث کو جذباتی اور سیاسی طور پر شدید بنا دیا ہے۔

چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی بلاول بھٹو زرداری نے کراچی میں میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے وفاقی وزیر داخلہ محسن نقوی کی ریفرنڈم کی تجویز پر شدید ردعمل ظاہر کیا اور واضح الفاظ میں کہا کہ اگر سندھ کو زبردستی تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی تو کراچی کی سڑکوں پر خون بہے گا اور یہ کشیدگی صرف ایک شہر تک محدود نہیں رہے گی۔ ان کا یہ بیان نہ صرف موجودہ بحث کا مرکز بن گیا بلکہ پاکستان کے وفاقی ڈھانچے، صوبائی خودمختاری اور جمہوری عمل کے بارے میں گہرے سوالات اٹھا دیتا ہے۔

محسن نقوی نے حالیہ دنوں میں نئے صوبوں یا انتظامی یونٹس کے قیام کے لیے ریفرنڈم کرانے کی تجویز پیش کی تھی۔

بلاول بھٹو نے اپنے ہاتھ کی انگلیاں جوڑیں اور ان کے سرے پر ماتھا ٹکاتے ہوئے بولے: ’مجھے نہیں پتا کہ محسن بھائی کرنا کیا چاہ رہے ہیں۔‘ کراچی میں میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے چیئرمین پیپلز پارٹی بلاول بھٹو کا اشارہ وفاقی وزیرِ داخلہ محسن نقوی کی جانب تھا۔ انھوں نے سوال کیا: ’اگر واقعی میرے بھائی (یعنی محسن نقوی) نئے صوبے بنانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے اتنی محنت کر رہے ہیں‘ تو پھر اس معاملے پر پیپلز پارٹی سمیت دیگر سیاسی قوتوں کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا گیا۔ واضح رہے کہ وفاقی وزیرِ داخلہ محسن نقوی نے حال ہی میں نئے صوبے بنانے کے لیے ریفرنڈم کرانے کی تجویز دی ہے۔

ان کا موقف یہ تھا کہ مختلف سرویز کے مطابق عوام کی اکثریت نئے صوبوں کی حامی ہے اس لیے فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر عوام مخالفت کریں تو اسے قبول کیا جائے اور اگر حمایت کریں تو پھر قیام کی راہ ہموار کی جائے۔ یہ تجویز اس پس منظر میں سامنے آئی جب نقوی نے ماضی میں بار بار کہا تھا کہ موجودہ انتظامی نظام کو لپس کر چکا ہے اور بہتر حکمرانی کے لیے نئے یونٹس ناگزیر ہیں۔ بلاول بھٹو نے اس تجویز کو غیر آئینی اور غیر مشاورتی قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر واقعی نئے صوبے بنانے کا ارادہ ہے تو پیپلز پارٹی سمیت دیگر سیاسی قوتوں کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا گیا۔ انھوں نے وزیرِ اعظم شہباز شریف سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے وزیر کو کنٹرول کریں کیونکہ اگر خود حکومتی وزرا وزیرِ اعظم کو کمزور کریں تو نظام کے کو لپس کی شکایت بے معنی ہو جاتی ہے۔

چیئرمین پیپلز پارٹی بلاول بھٹو زرداری نے کہا کہ کئی ماہ سے ملک میں نئے صوبوں کے قیام کی بحث ’زبردستی‘ چھیڑی جا رہی ہے، حالانکہ اس معاملے پر نہ پارلیمان میں کوئی باقاعدہ پیش رفت ہوئی ہے اور نہ ہی وفاقی کابینہ میں اس پر کوئی فیصلہ یا بحث ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا: ’اگر کابینہ نے اس معاملے پر غور ہی نہیں کیا تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک وفاقی وزیر مسلسل اسی مؤقف کو آگے بڑھا رہے ہوں۔‘

بلاول بھٹو نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں وزیرِ اعظم شہباز شریف کامیاب ہوں لیکن ان کے پاس ’اتنا اختیار تو ہونا چاہیے کہ اپنے وزیر کو کنٹرول کریں۔‘ ان کے بقول اگر وزیرِ اعظم شہباز شریف کے ’اپنے ہی وزیر انھیں کمزور کریں گے‘ تو پھر سسٹم کو لپس کرنے کی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ چیئرمین پیپلز پارٹی نے خبردار کیا کہ اگر صوبہ سندھ کی تقسیم زبردستی کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ’اگر زبردستی سندھ تقسیم کیا گیا تو کراچی کی سڑکوں پر جو خون بہے گا، اس پر سوال پوچھے جائیں گے۔ زبردستی صوبے تقسیم کیے گئے تو معاشرے میں تقسیم پیدا ہو گی اور یہ تقسیم دشمنی تک جا سکتی ہے۔‘ بلاول بھٹو نے کہا کہ ممکنہ کشیدگی صرف کراچی تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کے اثرات سندھ کے دیگر علاقوں تک پھیل سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا: ’میں وہ خون خرابہ نہیں دیکھنا چاہتا۔‘





> وہ چاہتے ہیں وزیرِ اعظم شہباز شریف کامیاب ہوں لیکن ان کے پاس ’اتنا اختیار تو ہونا چاہیے کہ اپنے وزیر کو کنٹرول کریں۔‘ اگر وزیرِ اعظم شہباز شریف کے ’اپنے ہی وزیر انھیں کمزور کریں گے‘ تو پھر سسٹم کو لپس کرنے کی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر صوبہ سندھ کی تقسیم زبردستی کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، چیئرمین پیپلز پارٹی بلاول بھٹو



ریفرنڈم سے متعلق سوال پر بلاول بھٹو نے کہا کہ اصل بات ’ریفرنڈم کی نہیں بلکہ نیت کی ہے۔‘ انھوں نے کہا کہ آئین میں نئے صوبوں کے قیام کا طریقہ کار پہلے سے موجود ہے، اس لیے جب کوئی شخص آئینی راستے کے بجائے ریفرنڈم یا کسی اور طریقے کی بات کرتا ہے تو اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ کسی غیر آئینی راستے کی تلاش میں ہے۔ ’اگر آپ غیر آئینی طریقہ تلاش کر رہے ہیں تو اس میں پیپلز پارٹی آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی‘ یہ بحث صرف دو رہنماؤں کے درمیان ذاتی اختلاف نہیں بلکہ پاکستان کی وفاقی ساخت، وسائل کی تقسیم، علاقائی عدم توازن اور سیاسی طاقت کے توازن سے جڑی ہوئی ہے۔ نئے صوبوں کی مانگ دہائیوں پرانی ہے۔ جنوبی پنجاب، ہزارہ، بہاولپور اور دیگر علاقوں میں الگ صوبے کی آوازیں بار بار اٹھتی رہی ہیں۔ حامیوں کا کہنا ہے کہ چار بڑے صوبے اتنے بڑے ہیں کہ دور دراز اضلاع تک حکومت کی پہنچ کمزور پڑ جاتی ہے، ترقیاتی فنڈز غیر منصفانہ تقسیم ہوتے ہیں اور مقامی مسائل حل نہیں ہوتے۔ مخالفین خاص طور پر سندھ میں یہ خدشہ رکھتے ہیں کہ تقسیم سے صوبائی شناخت، وسائل پر کنٹرول اور سیاسی اثر و رسوخ کمزور ہو جائے گا۔ پیپلز پارٹی سندھ میں اپنی مضبوط سیاسی بنیاد رکھتی ہے اور سندھ کی تقسیم کو اپنی سیاسی بقا کے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔ بلاول بھٹو کے بیان میں یہ حساسیت واضح طور پر جھلکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبردستی تقسیم سے معاشرے میں دشمنی پیدا ہو گی اور وہ ایسا خون خرابہ نہیں دیکھنا چاہتے۔

وفاقی وزیر اطلاعات عطا اللہ تارڑ نے بلاول کے بیان پر ردعمل دیتے ہوئے کہا کہ خون بہانے کی بات سمجھ سے بالاتر ہے اور اگر عوام نئے صوبے چاہتے ہیں تو بنا دیے جائیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ بحث کو روکا نہیں جا سکتا اور عوامی رائے جاننے کا بہترین ذریعہ ریفرنڈم ہے۔ پنجاب اسمبلی کے سپیکر ملک احمد خان نے بھی ریفرنڈم کی حمایت کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر عوام ریفرنڈم کے ذریعے رائے دے دیں تو منتخب نمائندوں کا اس کے خلاف جانا آئینی سوال بن سکتا ہے جس پر آئینی عدالت سے رہنمائی لی جا سکتی ہے۔

وزیر دفاع خواجہ آصف نے اس بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ سیاسی اتفاق رائے پیدا کیا جا سکتا ہے اور ان کی ذاتی رائے میں نئے سال تک نیا نظام سامنے آ سکتا ہے۔ انھوں نے آئینی عدالت کے کردار کا بھی ذکر کیا۔ آئین پاکستان میں نئے صوبوں کے قیام کا واضح طریقہ کار موجود ہے۔ آرٹیکل 239 کی ذیلی شق چار کے تحت کسی صوبے کی حدود میں تبدیلی کے لیے آئینی ترمیم درکار ہوتی ہے اور اس ترمیم کو متعلقہ صوبائی اسمبلی کے کل ارکان کی دو تہائی اکثریت سے منظور ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ قومی اسمبلی اور سینیٹ میں بھی دو تہائی اکثریت درکار ہوتی ہے۔ یہ طریقہ کار صوبائی خودمختاری کی ضمانت دیتا ہے اور کسی ایک طاقتور گروہ کو یکطرفہ طور پر حدود بدلنے سے روکتا ہے۔ ریفرنڈم کا ذکر آرٹیکل 48 کی ذیلی شق چھ میں ملتا ہے جس کے تحت وزیر اعظم قومی اہمیت کے معاملے پر پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس کی منظوری سے ریفرنڈم کروا سکتے ہیں۔ تاہم آئینی ماہرین کا کہنا ہے کہ ریفرنڈم آئینی ترمیم کا متبادل نہیں بن سکتا۔ سابق اٹارنی جنرل اشتر اوصاف نے واضح کیا کہ ریفرنڈم سے عوامی رجحان معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن نئے صوبوں کے قیام کے لیے آئین میں درج طریقہ کار ہی اختیار کرنا ہوگا۔ پلڈاٹ کے سربراہ احمد بلال محبوب کا بھی یہی موقف ہے کہ ریفرنڈم قانونی طور پر پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیوں کو پابند نہیں کرتا بلکہ صرف سیاسی اور اخلاقی دباؤ پیدا کر سکتا ہے۔

عوامی رائے کا معاملہ بھی متنازع ہے۔ کچھ سرویز میں نئے صوبوں کی حمایت ستر فیصد سے زائد بتائی گئی ہے جن میں سندھ اور کراچی میں بھی اعلیٰ شرح دکھائی گئی۔ تاہم ان سرویز کی ساکھ پر سوالات اٹھائے گئے ہیں اور کچھ کو غیر تصدیق شدہ قرار دیا گیا ہے۔ حقیقی عوامی رائے معلوم کرنے کے لیے شفاف، آزاد اور جامع طریقہ کار درکار ہے جس میں علاقائی، نسلی اور طبقاتی اختلافات کو مدنظر رکھا جائے۔ نئے صوبوں کے قیام سے سینیٹ میں نمائندگی، نیشنل فنانس کمیشن کے تحت وسائل کی تقسیم، پانی کے حقوق، معدنی وسائل اور بین الصوبائی تجارت جیسے مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ماہرین کا مشورہ ہے کہ اس سے قبل معاشی، سماجی، جغرافیائی اور انتظامی اثرات کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ تاریخی طور پر پاکستان میں صوبائی حدود کی تبدیلی ہمیشہ حساس رہی ہے۔ ایک یونٹ کے تجربے نے مشرقی پاکستان کے علیحدگی میں کردار ادا کیا۔ 1970 کی دہائی کے بعد صوبائی خودمختاری کی بحثیں جاری رہیں۔ اٹھارہویں ترمیم نے صوبوں کو مزید اختیارات دیے لیکن عملی طور پر بہت سے مسائل حل نہیں ہوئے۔

ملک معاشی مشکلات، سیاسی عدم استحکام اور ادارہ جاتی کمزوریوں کا شکار ہے۔ کچھ حلقے اسے سیاسی ری سیٹ کا حصہ قرار دیتے ہیں جبکہ دوسرے اسے صوبائی طاقت کے توازن کو تبدیل کرنے کی کوشش سمجھتے ہیں۔ (باقی صفحہ 15 پر)



زمین سے ایک نوری دن کا فاصلہ مکمل کرنے والا جہاز جس میں خلائی مخلوق کے لیے اردو میں بھی پیغام ہے

اس سپیس کرافٹ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں 12 انچ قطر کی سنہری ڈسک نصب ہے، جس میں زمین کے مختلف باشندوں کی جانب سے اردو سمیت 55 زبانوں میں پیغامات شامل ہیں۔

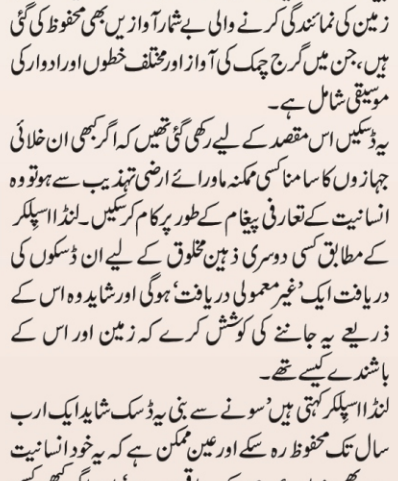

.....میگزین رپورٹ.....

18 نومبر 2026 یعنی آج کے روز ناسا کی جانب سے 1977 میں بھیجے گئے جڑواں خلائی مشنوں میں سے ایک وائجر ون زمین سے ایک نوری دن (لائٹ ڈے) کا فاصلہ طے کر چکا ہے۔ یہ وہ فاصلہ ہے جو روشنی ایک دن میں طے کرتی ہے، یعنی تقریباً 26 ارب کلومیٹر۔ مگر خلائی مشن وائجر ون کو ایسا کرنے میں 50 سال لگے۔ اس سپیس کرافٹ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں 12 انچ قطر کی سنہری ڈسک نصب ہے، جس میں زمین کے مختلف باشندوں کی جانب سے اردو سمیت 55 زبانوں میں پیغامات شامل ہیں۔ یہ پیغامات ممکنہ خلائی مخلوق کے لیے ریکارڈ گئے ہیں۔

اردو میں ان کے لیے 'سلام، ہم زمین کے باشندوں کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں' کے الفاظ ریکارڈ کیے گئے ہیں، جبکہ ہندی کا لفظ 'نمستے' بھی سپیس کرافٹ میں موجود ڈسک کے ریکارڈ کا حصہ ہے۔

وائجر ون انسان کی بنائی ہوئی کسی بھی دوسری چیز کے مقابلے میں زیادہ دور جا چکا ہے۔ لیکن اس کے طے کیے گئے فاصلے سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ناسا اب بھی اس خلائی مشن سے سگنل موصول کر رہا ہے۔ صرف پانچ سال تک کام کرنے کے لیے تیار کیے گئے وائجر ون اور وائجر ٹو تقریباً 50 برس خلا میں گزارنے کے باوجود آج بھی فعال ہیں اور ماہرینِ فلکیات کو کائنات کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات فراہم کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ ایسی ٹیکنالوجی کے ذریعے کر رہے ہیں جو آج کے دور کے معیار کے مطابق انتہائی سادہ اور قدیم معلوم ہوتی ہے۔ مشن کی موجودہ پراجیکٹ سائنس دان ڈاکٹر لنڈا اسپلکر کے مطابق 'آپ کی گاڑی کے ریموٹ میں جتنی میموری ہوتی ہے، تقریباً اتنی ہی وائجر کے کمپیوٹروں میں موجود ہے۔' انھوں نے کہا 'اپنے دور کے لحاظ سے یہ واقعی ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔'

'گرینڈ ٹور'

وائجر مشن انسانی تاریخ میں نظامِ شمسی کی دریافت کے تیزی سے آگے بڑھتے سفر کا تسلسل تھے۔ ان کی روانگی سے پندرہ سال قبل 1962 میں جب ناسا کا میرینر ٹو زہرہ کے قریب سے گزرا تو امریکی خلائی ادارہ اس مشن کے ذریعے کسی دوسرے سیارے تک اپنی تاریخ کا پہلا کامیاب مشن مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تین سال بعد میرینر فور مریخ کے قریب سے گزرا اور زمین سے باہر کسی دوسرے سیارے کی پہلی قریبی تصاویر حاصل کیں۔ نظامِ شمسی کے چار بڑے بیرونی سیاروں یعنی مشتری، زحل، یورینس اور نیپچون تک پہنچنے کے منصوبے اس وقت وجود میں آئے جب امریکی خلائی انجینئر گیری فلینڈرو نے پیش گوئی کی کہ 1970 کی دہائی کے اواخر میں یہ سیارے ایک نایاب ترتیب میں آ جائیں گے۔ اس غیر معمولی صف بندی کی بدولت ایک ممکنہ خلائی جہاز کے لیے ان سیاروں کا سفر نسبتاً آسان ہو جاتا، یوں سائنس دانوں کے بقول 'گرینڈ ٹور' کے نام سے معروف اس مہم کے لیے زندگی میں صرف ایک بار ملنے والا موقع پیدا ہوا۔

اس وقت اس خلائی خطے کے بارے میں ہماری معلومات نہایت محدود تھیں۔ خلائی تاریخ کی محقق اور مصنفہ ایمی شیرا ٹیٹیل کہتی ہیں 'قدیم یونانی مشتری اور زحل کے بارے میں جانتے تھے، لیکن وہ محض روشنی کے نقطے تھے۔' وہ کہتی ہیں کہ وائجر مشن نے صورتِ حال یکسر بدل دی۔ 'اچانک ہم سیاروں کے بارے میں ایک مبہم تصور سے نکل کر اس مرحلے پر پہنچ گئے جہاں ان کی مانوس تصاویر ہر کلاس روم میں نظر آنے لگیں۔'

ناسا کا پہلا بیرونی سیاروں کا مشن پائنیر 10 1973 میں مشتری کے قریب سے گزرا۔ اس مشن نے ثابت کیا کہ مریخ اور مشتری کے درمیان واقع شہابی پٹی کو کامیابی سے عبور کیا جا سکتا ہے اور لاکھوں کلومیٹر دور سے زمین کے ساتھ رابطہ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے جڑواں مشن پائنیر 11 نے چھ سال بعد زحل کا مشاہدہ کیا۔ تاہم یہ دونوں خلائی جہاز وائجر مشنز کے مقابلے میں بہت سادہ تھے۔

سنہ 1969 میں امریکہ نے چاند پر انسان اتارنے کی دوڑ میں سوویت یونین پر سبقت حاصل کر لی تھی، لیکن اس کامیابی کے بعد ناسا کو مستقبل کے خلائی مشنز کے لیے سیاسی حمایت اور مالی وسائل کے حوالے سے نسبتاً کم توجہ ملنے لگی۔ وائجر مشن کے لیے ابتدائی طور پر تیار کیا گیا 'گرینڈ ٹور' منصوبہ بعد میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک نسبتاً محدود مشن اختیار کیا گیا، جس کے تحت صرف دو بیرونی سیاروں کا دورہ کیا جانا تھا۔ تاہم پس منظر میں سائنس دان خاموشی سے وائجر خلائی جہازوں کو اس طرح تیار کر رہے تھے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ دور تک سفر کر سکیں۔ فلکی طبیعیات دان ڈاکٹر ایلن کمنگز، جو آج بھی وائجر مشن سے وابستہ ہیں، کہتے ہیں 'سرکاری طور پر ہم مشتری اور زحل تک پانچ سالہ مشن کے لیے خلائی مشن تیار کر رہے تھے، لیکن یوں سمجھ لیں کہ ہم نے احتیاطاً انہیں کچھ زیادہ عرصے تک چلنے کے قابل بنا دیا تھا۔'

وائجر ون اور وائجر ٹو ایک جیسے خلائی جہازوں کے طور پر تیار کیے گئے تھے۔ وائجر ٹو کو اگست 1977 میں خلا میں بھیجا گیا، جبکہ وائجر ون ایک ماہ بعد روانہ ہوا۔ دونوں کو مختلف راستوں پر بھیجا گیا اور اسی سال کے اختتام تک وائجر ون اپنے جڑواں مشن سے آگے نکل گیا۔

وائجر نے ہمیں نئی دنیا سے متعارف کروایا

آخرکار خود وائجر خلائی جہازوں نے ہی اپنی اہمیت کا ثبوت دے دیا۔ جیسے ہی انھوں نے ہماری کائناتی ہمسائیگی کے بارے میں ماہرینِ فلکیات کے قائم کردہ تصورات کو بدلنا شروع کیا، دنیا بھر میں لوگ حیران رہ گئے۔ مثال کے طور پر وائجر ون نے مشتری کے چاند آئی او پر زمین سے باہر موجود پہلے فعال آتش فشاں دریافت کیے۔ اسی مشن نے مشتری پر بجلی چمکنے کے شواہد بھی ریکارڈ کیے، جو زمین کے علاوہ کسی اور دنیا پر اس نوعیت کی پہلی دریافت تھی۔ وائجر ٹو کی جانب سے بھیجی گئی تصاویر سے یہ عندیہ ملا کہ مشتری کے ایک اور چاند یورپا کی برف سے ڈھکی اور شگافوں والی سطح کے نیچے مائع پانی کا ایک سمندر موجود ہو سکتا ہے۔ یہی دریافت آج تک ماہرینِ فلکیات کو اس امکان پر غور کرنے پر آمادہ کیے ہوئے ہے کہ وہاں زندگی موجود ہو سکتی ہے۔ کمنگز کو یاد ہے کہ جب انہوں نے پہلی بار آئی او کی تصاویر دیکھیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔





وہ یاد کرتے ہیں کہ 'میں درحقیقت یونیورسٹی کیمپس میں تھا اور وہاں براہِ راست ویڈیو فیڈ دکھائی جا رہی تھی۔ آئی او اپنی پوری شان کے ساتھ سامنے تھا اور مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ہماری اپنی چاند کی سطح تو بہت سرمئی اور غیر دلچسپ ہے اور۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان چاندوں میں اتنا تنوع بھی ہو سکتا ہے۔'

مشن کے آغاز کے چار سال بعد ناسا نے فیصلہ کیا کہ وائجر ٹو اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے یورینس اور نیپچون کا بھی مشاہدہ کریگا۔ اس نے 1986 اور 1989 میں ان دونوں سیاروں کے قریب سے پرواز کی اور یوں 'گرینڈ ٹور' مکمل کر لیا۔

'نیلا نقطہ'

وائجر خلائی جہازوں نے اپنے مقاصد ذہانت اور جدید ٹیکنالوجی کے امتزاج سے حاصل کیے۔ نام نہاد 'سلنگ شاٹ' تکنیک کے ذریعے انھیں ہر سیارے کی کششِ ثقل سے رفتار حاصل کرنے اور اپنی سمت تبدیل کرنے کا موقع ملا تاکہ وہ اپنے اگلے ہدف تک پہنچ سکیں۔ اس طریقہ کار نے نیپچون تک سفر کا دورانیہ 30 سال سے کم کر کے صرف 12 سال کر دیا۔ ان خلائی کھوجیوں کو پلوٹونیم سے چلنے والی جوہری بیٹریوں سے لیس کیا گیا تھا۔ تاہم ان کی توانائی میں ہر سال تقریباً چار واٹ کی کمی آتی جا رہی ہے اور اسی وجہ سے انکے بیشتر سائنسی آلات کو ایک ایک کر کے بند کیا جا چکا ہے۔

وائجر ون نے 1990 میں اپنا کیمرا ہمیشہ کے لیے بند کرنے سے ذرا پہلے، جب وہ نیپچون سے بھی آگے نکل چکا تھا، مڑ کر زمین کی ایک تصویر لی۔ اس تصویر میں ہمارا سیارہ خلا کی وسعتوں میں ایک ننھے سے مدھم نیلے نقطے کی صورت دکھائی دیتا تھا۔ یہ خیال معروف ماہر فلکیات کارل سیگن کا تھا۔ لنڈا اسپلکر کو یاد ہے کہ 'کارل سیگن کہا کرتے تھے کہ اس مدھم نیلے نقطے پر ہر وہ انسان موجود ہے جو کبھی زندہ رہا، ہر وہ شخص جسے آپ نے کبھی جانا۔' وہ کہتی ہیں کہ اس تصور میں ایک اہم پیغام بھی پوشیدہ تھا 'ہمیں اپنے سیارے کی حفاظت کرنی چاہیے۔'

بین النجمی خلا

سنہ 2012 میں وائجر ون سورج کی شمسی ہوا کے بیرونی کنارے، جسے ہیلیو سفیئر کہا جاتا ہے، سے باہر نکل کر بین النجمی خلا میں داخل ہونے والی انسان کی بنائی ہوئی پہلی چیز بن گیا۔ اس کا جڑواں خلائی جہاز وائجر ٹو چھ سال بعد اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسی خطے میں پہنچا۔ یہ دونوں خلائی جہاز آج بھی زمین پر معلومات بھیج رہے ہیں۔ وہ مقناطیسی میدانوں سمیت مختلف مظاہر کے بارے میں ڈیٹا فراہم کر رہے ہیں، جس سے خلا کے ایک ایسے خطے کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہو رہی ہیں جس کا اس سے پہلے کبھی براہِ راست مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔ وائجر مشن کے موجودہ سائنسی منصوبوں میں شامل ڈاکٹر بل کرتھ کہتے ہیں 'اس وقت بین النجمی خلا کے ماحول کا براہِ راست مشاہدہ کرنے والا واحد آلہ وائجر ہی ہے۔' وہ مزید کہتے ہیں 'سمندر کو سمجھنے کے لیے اس میں خود اترنے سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ وائجر بھی ہمیں بین النجمی خلا کو اسی طرح سمجھنے کا موقع دے رہا ہے۔' ناسا کا اندازہ ہے کہ دونوں خلائی جہاز 2030 کی دہائی تک کم از کم ایک سائنسی آلہ فعال رکھنے کے قابل رہیں گے۔ لنڈا اسپلکر کہتی ہیں 'ہم اس مشن کو جاری رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہیں گے۔' وہ مزید کہتی ہیں 'ہم اسے بند کرنے کا بٹن نہیں دبائیں گے۔ اس کے بجائے ہم وائجر کو خود فیصلہ کرنے دیں گے کہ اس کے سفر کو ختم کرنے کا وقت کب آتا ہے۔'

ایک 'شاندار کھوج'

ڈاکٹر بل کرتھ کہتے ہیں 'وائجر انسانی جستجو اور کھوج کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ درحقیقت انسانیت کی اس مہم کی نمائندگی کرتا ہے جس کے ذریعے وہ کائنات میں اپنی جگہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔' ان کے خیال میں وائجر نے ثابت کیا کہ بیرونی سیارے 'اتنے سادہ نہیں جتنے ہم ابتدا میں سمجھتے تھے' اور اسی نے بعد کے خلائی مشنز کی راہ ہموار کی۔ ناسا کا یوروپا کلپر اس وقت مشتری کے چاند یوروپا کی جانب سفر کر رہا ہے، جبکہ یورپی خلائی ایجنسی کا جوپیٹر آئسی مونز ایکسپلورر (جوس) مشن 2031 میں اپنے ہدف تک پہنچنے کی توقع رکھتا ہے۔ تاہم وائجر خلائی جہازوں کا مقصد صرف زمین پر معلومات بھیجنا ہی نہیں ہے۔

ان میں سے ہر ایک میں 12 انچ قطر کی سونے سے ملمع شدہ ایک ڈسک نصب ہے، جس میں زمین کے باشندوں کی جانب سے 55 زبانوں میں ریکارڈ کیے گئے خیر سگالی کے پیغامات شامل ہیں۔ اس کے ساتھ 115 تصاویر اور ہماری زمین کی نمائندگی کرنے والی بے شمار آوازیں بھی محفوظ کی گئی ہیں، جن میں گرج چمک کی آواز اور مختلف خطوں اور ادوار کی موسیقی شامل ہے۔

یہ ڈسکیں اس مقصد کے لیے رکھی گئی تھیں کہ اگر کبھی ان خلائی جہازوں کا سامنا کسی ممکنہ ماورائے ارضی تہذیب سے ہو تو وہ انسانیت کے تعارفی پیغام کے طور پر کام کر سکیں۔ لنڈا اسپلکر کے مطابق کسی دوسری ذہین مخلوق کے لیے ان ڈسکوں کی دریافت ایک 'غیر معمولی دریافت' ہوگی اور شاید وہ اس کے ذریعے یہ جاننے کی کوشش کرے کہ زمین اور اس کے باشندے کیسے تھے۔

لنڈا اسپلکر کہتی ہیں 'سونے سے بنی یہ ڈسک شاید ایک ارب سال تک محفوظ رہ سکے اور عین ممکن ہے کہ یہ خود انسانیت سے بھی زیادہ عرصے تک باقی رہے۔' اور اگر کبھی کسی ماورائے ارضی تہذیب کو وائجر مل گیا، تو ممکن ہے اسے ایک اور پراسرار پیغام بھی دریافت ہو۔ 1970 کی دہائی میں ایلن کمنگز اپنے اس جذبے پر قابو نہ پا سکے کہ وہ اس سائنسی آلے پر، جس کی تیاری میں انھوں نے مدد کی تھی، اپنے ابتدائی حروف کندہ کر دیں۔ وہ ہنستے ہوئے کہتے ہیں 'اس کی اجازت نہیں لی گئی تھی۔ لیکن اب وہ میرا کیا ہی کر سکتے ہیں؟'

☆.....☆

سپر ایل نینو 27-2026 کا موسمی بحران

بحرالکاہل کی گہرائیوں سے اٹھتی حرارت، پاکستان کی زراعت، پانی اور غذائی تحفظ پر گہرے اثرات، اور تیاری کا لمحہ، کیا دنیا خطرے سے نمٹنے کے لئے تیار ہے؟

.....شیر دل خان.....

اقوام متحدہ اور عالمی موسمیاتی اداروں نے خبردار کیا ہے کہ دنیا کے کئی خطے سپر ایل نینو کے باعث شدید موسمی اثرات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ رواں سال کے اختتام کے قریب ایل نینو اپنی بلند ترین شدت پر پہنچنے والا ہے، جبکہ اس کے اثرات طویل عرصے تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہ مظہر خشک سالی، سیلاب اور فصلوں کے نقصان کا خطرہ بڑھا رہا ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق اگلے چند ماہ نہ صرف اگلی فصل کو محفوظ بنانے بلکہ غیر یقینی موسمی مستقبل کی تیاری کا موقع بھی ہیں۔ سپر ایل نینو بحرالکاہل کے استوائی خطے میں سمندری سطح کے درجہ حرارت میں غیر معمولی اضافے سے جنم لیتا ہے۔ امریکی قومی سمندری و فضائی انتظامیہ (این او اے اے) کے مطابق مشرقی استوائی بحرالکاہل میں سطحی درجہ حرارت کا انحراف بعض مقامات پر +3 ڈگری سیلسیس سے تجاوز کر چکا ہے، جبکہ زیرِ سطح پانی میں یہ انحراف +10 ڈگری سیلسیس تک پہنچ چکا ہے۔ سمندر اور فضا کے باہمی تعامل سے ہواؤں، بادلوں اور بارش کے نظام میں تبدیلی آتی ہے، جس کے اثرات ہزاروں کلومیٹر دور تک پھیلتے ہیں۔ این او اے اے کے تازہ جائزوں کے مطابق 2026-27 کا ایل نینو بہت مضبوط ہے اور تاریخی شدت اختیار کرنے کے امکانات اب بھی موجود ہیں۔ تاہم اثرات کا انحصار مقامی جغرافیہ اور دیگر موسمی عوامل پر ہوتا ہے، اس لیے ہر خطے میں ایک جیسا نتیجہ لازمی نہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارہ خوراک و زراعت (ایف اے او) کے مطابق مضبوط ایل نینو افریقہ کے جنوبی علاقوں، وسطی امریکہ اور جنوبی ایشیا کے بعض حصوں میں زرعی خشک سالی کا خطرہ بڑھاتا ہے، جبکہ دوسرے علاقوں میں شدید بارشیں اور سیلاب کا امکان رہتا ہے۔ ماضی کے واقعات میں 2023-24 کے ایل نینو کے دوران مراکش میں اناج کی پیداوار 43 فیصد کم ہوئی اور جنوبی افریقہ میں کروڑوں افراد غذائی عدم تحفظ کا شکار ہوئے۔ ایف اے او نے خبردار کیا ہے کہ اس بار بھی فصلوں کی تباہی، مویشیوں کے لیے چارے کی کمی اور سنگین غذائی







دوسری آفات کے برعکس، ال نینو کی آمد کے آثار پہلے ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ سائنس دان بحرالکاہل میں اس کی تشکیل اور پیش رفت پر نظر رکھ سکتے ہیں جس سے حکومتوں کو تیاری کے لیے قیمتی وقت مل جاتا ہے بشرطیکہ ان کے پاس اس مقصد کے لیے وسائل اور بروقت اقدامات کا عزم موجود ہو۔ عالمی موسمیاتی ادارے (ڈبلیو ایم او) کے ترجمان کا کہنا ہے کہ متوقع طور پر یہ ال نینو بہت شدید ہوگا اور اس سے زیادہ شدید درجے کی کوئی درجہ بندی ادارے کے پاس موجود نہیں ہے۔ توقع ہے کہ سال کے اختتام کے کافی حد تک واضح اندازہ ہو جاتا ہے کہ ال نینو کے بڑے اثرات کہاں مرتب ہوں گے اور وہ خوراک اور غذائی تحفظ کو کس طرح متاثر کریں گے۔ ایف اے او کے مطابق، حالیہ ال نینو کے باعث افریقہ کے جنوبی علاقوں، ساحلی خطے، وسطی امریکہ کے خشک خطوں اور جنوبی و جنوب مشرقی ایشیا کے بعض حصوں میں زرعی خشک سالی کا خطرہ کہیں زیادہ ہے۔ بعض دوسرے علاقوں میں شدید بارشیں اور سیلاب زیادہ بڑا خطرہ بن سکتے ہیں جبکہ غیر معمولی طور پر گرم سمندری پانی ماہی گیری اور ساحلی آبادیوں کے روزگار کو

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ممکنا خطرات سے خبردار کر دیا گیا، ممالک کو خشک سالی اور سیلابوں کا سامنا ہو سکتا ہے





بحران کا خدشہ موجود ہے۔

سپر ایل نینو موسمی کیفیت بحرالکاہل کے استوائی خطے میں جنم لیتی ہے لیکن اس کی شدت میں اضافہ بارش کے نظام اور حدت کو اس انداز میں تبدیل کر سکتا ہے جس سے دنیا کے کئی خطوں میں فصلوں اور غذائی رسد پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جنرل اسمبلی کے اجلاس میں اقوام متحدہ کے ادارہ خوراک و زراعت (ایف اے او) کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور ماحولیاتی امور کے سربراہ کاوے زاہدی نے بتایا کہ ال نینو بہت زیادہ گرم موسمی پس منظر میں تشکیل پا رہا ہے۔ اس کا مطلب فصلوں کی مکمل تباہی، مویشیوں کے لیے مناسب چراگاہوں کی کمی اور سنگین غذائی بحران بھی ہو سکتا ہے۔ بعض قریب یہ اپنی شدت کی بلند ترین سطح پر پہنچے گا تاہم اس کے اثرات طویل عرصہ تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ایف اے او کے کاوے زاہدی کا کہنا ہے کہ ال نینو فصلوں کی مکمل تباہی، مویشیوں کے لیے مناسب چراگاہوں کی کمی اور سنگین غذائی بحران کا سبب بھی ہو سکتا ہے۔

ڈبلیو ایم او کی سیکرٹری جنرل سیلیسٹ ساؤلو کا کہنا ہے کہ ادارے کے پاس ال نینو کے حوالے سے پیش گوئی کا انتظام اور سائنسی معلومات موجود ہیں جن کی بدولت حکومتیں اب آفات وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ان سے لاحق ممکنہ خطرات کے بارے میں کہیں زیادہ جانتی ہیں۔ کاوے زاہدی کا کہنا ہے کہ دونوں طرح کی معلومات کو یکجا کر کے متاثر کر سکتا ہے۔

2023 اور 2024 میں آنے والے شدید ال نینو کے دوران گرمی اور خشک سالی کے باعث مراکش میں اناج کی پیداوار میں 43 فیصد کمی واقع ہوئی۔ افریقہ کے جنوبی ممالک کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ کی بدترین خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں 6 کروڑ 10 لاکھ افراد کو امداد کی ضرورت پیش آئی اور 80 لاکھ سے زیادہ لوگ غذائی عدم تحفظ کا شکار ہوئے۔ کمزور فصلوں نے دنیا بھر میں بعض بنیادی غذائی اجناس کی قیمتوں میں بھی اضافہ کیا۔ ال نینو کے اثرات سے نمٹنے کی تیاری کے لیے بعض اقدامات بظاہر بہت سادہ ہیں جیسا کہ خشک سالی برداشت کرنے والے بیج، پانی ذخیرہ کرنے کے بہتر انتظامات، صحت مند زمین، مویشیوں کا تحفظ اور ایسے بروقت انتباہی نظام جو کسانوں تک اتنا جلد پہنچیں کہ وہ کاشت کا وقت یا فصل تبدیل کر سکیں۔ کاوے زاہدی کہتے ہیں کہ آئندہ فصل کو محفوظ بنانے کے لیے ضروری اقدامات فروری اور مارچ تک مکمل کر لینا چاہیے۔ ایف اے او کے مطابق، ال نینو کے لیے تیاری دراصل مختصر مدت میں موسمیاتی موافقت کی ہی ایک شکل ہے۔ تاہم زرعی و غذائی نظام کے لیے دستیاب مالی وسائل مسلسل کم ہو رہے ہیں۔ 2024 میں ان کے لیے موسمیاتی تبدیلی سے متعلق ترقیاتی مالی معاونت میں 10 فیصد کمی آئی جو 26.9 ارب ڈالر رہ گئی۔ فصلوں، مویشیوں، جنگلات اور ماہی گیری کے شعبوں کو مجموعی موسمیاتی ترقیاتی مالی معاونت کا صرف تقریباً پانچ فیصد ملا۔ افریقہ میں یہ مالی معاونت 20 فیصد کم ہوئی جبکہ پورے براعظم کے لیے مجموعی موسمیاتی مالی معاونت میں اضافہ ہوا تھا۔ ال نینو کے باعث دنیا کے مختلف خطوں میں شدید خشک سالی، تباہ کن سیلاب اور سخت گرمی کی لہریں آنے کا خدشہ ہے۔ کاوے زاہدی کہتے ہیں کہ غذائی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے خاص طور پر ال نینو کے سال میں اس سرمایہ کاری کو بڑھانا ہوگا۔ ایف اے او نے واضح کیا ہے کہ ال نینو کے اثرات سے نمٹنے کے لیے سرمایہ کاری صرف زراعت کو موسمیاتی دھچکوں سے محفوظ بنانے تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ خود زراعت کو بھی مسئلے کے حل کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

2026-27 کا موجودہ ایل نینو معمول کے ایک موسمی مرحلے سے بڑھ کر عالمی سائنسی توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ این او اے اے نے واضح کیا کہ شمالی نصف کرہ ارض کے خزاں اور موسمِ سرما 2026-27 کے دوران بہت مضبوط ایل نینو کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اگر اکتوبر، نومبر اور دسمبر 2026 کے تین ماہ کا آر او این آئی +2.5 ڈگری سیکسیس یا اس سے زیادہ رہا تو یہ 1950 کے بعد ریکارڈ کیے گئے سابقہ ایل نینو واقعات کے مقابلے میں انتہائی شدید واقعہ شمار ہوگا۔ تازہ ترین جائزوں کے مطابق ایل نینو موجود ہے اور مسلسل مضبوط ہو رہا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سپر ایل نینو کی اصطلاح عوامی اور صحافتی گفتگو میں سامنے آتی ہے۔ اس صورتِ حال کی اہمیت صرف بحرالکاہل تک محدود نہیں۔ ایل نینو ایک عالمی سطح پر مربوط موسمیاتی نظام کو متاثر کر سکتا ہے۔ اس کے اثرات کہیں زیادہ بارش، کہیں خشک سالی، کہیں غیر معمولی گرمی اور کہیں سمندری و فضائی طوفانی سرگرمی کی صورت میں سامنے آ سکتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک اور احتیاط ضروری ہے: کسی مضبوط ایل نینو کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا کے ہر خطے میں لازماً ایک ہی قسم کا موسم پیدا ہوگا۔ اثرات کا انحصار جغرافیہ، موسم کے مرحلے، دیگر سمندری و فضائی عوامل اور مقامی موسمیاتی حالات پر ہوتا ہے۔ خود این او اے اے بھی واضح کرتا ہے کہ ایل نینو کی شدت اور کسی مخصوص علاقے پر اس کے اثرات کی شدت ایک ہی چیز نہیں اور مضبوط واقعہ بھی کسی مخصوص اثر کی ضمانت نہیں دیتا۔ یوں 2026-27 کا اصل سوال صرف یہ نہیں کہ ایل نینو کتنا شدید ہوگا بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی سمندری حرارت، فضائی گردش اور دیگر موسمیاتی عوامل کے ساتھ باہمی تعامل کس طرح دنیا کے مختلف خطوں میں موسم کا نقشہ تشکیل دے گا۔

پاکستان کے لیے یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کہ ملک کا زرعی، آبی اور معاشی نظام موسمی بارشوں سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ بالخصوص دریائے سندھ کے بالائی علاقوں میں بارش اور برف پگھلنے کے نظام میں ہونے والی تبدیلیاں پانی کی دستیابی پر اثر ڈال سکتی ہیں۔ تاہم کسی مخصوص سال میں پاکستان کی بارش، سیلاب یا خشک سالی کو صرف ایل نینو سے براہِ راست منسوب کرنا سائنسی طور پر محتاط طرزِ عمل نہیں ہوگا۔ ایل نینو ایک اہم عالمی عامل ہو سکتا ہے، مگر مقامی اور علاقائی موسمیاتی عوامل بھی نتیجے کو بدل سکتے ہیں۔ اسی طرح کراچی جیسے ساحلی شہر کے بارے میں بھی یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ موجودہ ایل نینو لازماً کسی ایک مخصوص درجہ حرارت، بارش یا شہری موسمی واقعے کا سبب بنے گا۔ کراچی کا موسم بحیرہ عرب، مقامی ہواوں، سمندری سطح کے درجہ حرارت، مغربی ہواوں کے نظام اور علاقائی فضائی گردش سمیت متعدد عوامل سے تشکیل پاتا ہے۔ ایل نینو اس بڑے نظام کے ایک حصے کو متاثر کر سکتا ہے، لیکن کسی مخصوص مقامی نتیجے کی پیش گوئی کے لیے علاقائی موسمیاتی ماڈلز اور تازہ مشاہدات ضروری ہیں۔ (باقی صفحہ 15 پر)





’اب والدین بیٹی کو جہیز میں بھی سولر پینل دیتے ہیں‘

شمسی توانائی کا انقلاب جس نے حکومت کو مشکل میں ڈال دیا

پہلے شادیوں میں موٹر سائیکلیں یا دیگر گھریلو سامان تحفے میں دیا جاتا تھا، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ ’اب لوگ سولر پینل اور ایئر کولر تحفے میں دیتے ہیں۔ یہ تقریباً ہر گھر کی ضرورت بن چکے ہیں۔‘

.....میگزین رپورٹ.....

شادی کے صرف تین ماہ بعد دیہی پنجاب میں فیصل شہزاد کا گھر دلہن کے خاندان کی جانب سے دیے گئے جہیز سے بھرا ہوا ہے۔ زیورات، چمکتی ہوئی چاندی کی اشیا، صوفے اور ایک ایئر کنڈیشنر تو موجود ہیں، لیکن ان کے نزدیک سب سے قیمتی تحفہ وہ 340 واٹ کا سولر پینل ہے جو بستر کے نیچے محفوظ رکھا گیا ہے۔ فیصل شہزاد کہتے ہیں کہ ’گرمیوں میں ہم اسے صبح آٹھ بجے سے شام تک استعمال کرتے تھے اور دن کے وقت ہمیں گرڈ کی بجلی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ہم اپنا ایئر کولر سارا دن اسی پر چلاتے تھے۔ ملک میں گذشتہ چند برسوں کے دوران سولر توانائی کے استعمال میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ درآمد شدہ سولر پینل اب گھروں کی چھتوں، ہسپتالوں، زرعی زمینوں اور صنعتی علاقوں سمیت ملک بھر میں عام دکھائی دیتے ہیں۔ توانائی کے شعبے پر تحقیق کرنے والے ادارے ’رینیوایبلز فرسٹ‘ کے مطابق 2018 سے 2025 کے درمیان پاکستان میں شمسی توانائی سے پیدا ہونے والی بجلی کا حصہ ایک فیصد سے بڑھ کر 28 فیصد تک پہنچ گیا، جبکہ اب تقریباً 70 لاکھ گھرانوں میں سولر پینل نصب ہیں۔

فیصل شہزاد کہتے ہیں کہ پہلے شادیوں میں موٹر سائیکلیں یا دیگر گھریلو سامان تحفے میں دیا جاتا تھا، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ ’اب لوگ سولر پینل اور ایئر کولر تحفے میں دیتے ہیں۔ یہ تقریباً ہر گھر کی ضرورت بن چکے ہیں۔‘ اگرچہ شہزاد کے گھر میں سولر پینل موجود ہیں، تاہم وہ اپنی توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اب بھی قومی گرڈ پر انحصار کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اور اپنے بھائیوں کے خاندانوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، جہاں بیک وقت کئی برقی آلات استعمال ہوتے ہیں۔

پاکستان جیسے ملک میں، جہاں اوسط ماہانہ آمدنی 40 ہزار روپے سے بھی کم ہے، بجلی کے بڑھتے ہوئے بل کئی خاندانوں کے لیے بڑا بوجھ بن چکے ہیں۔ بہت سے گھروں کے ماہانہ بل 15 سے 18 ہزار روپے تک پہنچ رہے ہیں، جس کی وجہ سے لوگ متبادل توانائی کے ذرائع کی جانب تیزی سے مائل ہو رہے ہیں۔ ادھر اس سال کوپ 31 کے موقع پر دنیا کو فوسل فیول پر انحصار کم کرنے اور گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں کمی لانے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ ملک میں شمسی توانائی اپنانے کی ایک نمایاں مثال کے طور پر سامنے آیا ہے، تاہم ماہرین کے مطابق سولر توانائی کی اس تیز رفتار مقبولیت کے اثرات اب قومی بجلی کے نظام پر بھی نمایاں ہونے لگے ہیں۔

ملک میں بجلی کی پیداوار کا نیا بحران

ملک میں سولر توانائی کی جانب تیزی سے بڑھتا رجحان کسی حکومتی منصوبہ بندی یا پالیسی کا نتیجہ نہیں بلکہ عام شہریوں کے اپنے فیصلوں کا حاصل ہے۔ جن لوگوں سے بات کی گئی، ان میں سے بیشتر کا کہنا تھا کہ انہوں نے بار بار کی لوڈشیڈنگ، قومی گرڈ کی غیر یقینی فراہمی اور بجلی کی مسلسل بڑھتی قیمتوں سے نجات پانے کے لیے سولر پینلز نصب کیے۔ توانائی کے شعبے پر تحقیق کرنے والے ادارے رینیوایبلز فرسٹ کے انڈسٹری رابطہ کار محمد حسن داجانہ کے مطابق گذشتہ چند برسوں میں بجلی کے نرخ دگنے سے بھی زیادہ بڑھ چکے ہیں، جبکہ چینی ساختہ سولر پینلز کی قیمتوں میں تقریباً 93 فیصد کمی آئی ہے۔ اس طرح سولر نظام عام صارفین کے لیے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابلِ رسائی ہو گیا ہے۔

وزیرِ توانائی اویس احمد لغاری کے مطابق لوگوں نے بڑھتے ہوئے اخراجات سے نمٹنے کے لیے خود متبادل راستہ اختیار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ’لوگوں نے زندہ رہنے کے لیے ایک اور راستہ تلاش کر لیا ہے۔ یہ ایک مثبت پیش رفت ہے۔ ہم نے حالات کے مطابق خود کو ڈھالا ہے اور لوگوں نے معاشی طور پر قابلِ عمل اور مؤثر انداز میں ردِعمل دیا ہے۔‘ اگرچہ سولر توانائی کے پھیلاؤ سے پاکستان کو واضح فوائد حاصل ہو رہے ہیں، خصوصاً اس لیے کہ ملک بڑی مقدار میں درآمدی ایندھن پر انحصار کرتا ہے، لیکن ماہرین اس کے کچھ ممکنہ منفی اثرات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان خدشات میں ایک خطرہ نام نہاد ’یوٹیلٹی ڈیتھ سپائرل‘ کا ہے۔ اس صورتِ حال میں جب زیادہ سے زیادہ صارفین سولر توانائی اپنا لیتے ہیں تو وہ قومی گرڈ سے کم بجلی خریدتے ہیں۔ نتیجتاً گرڈ کے نظام کو چلانے اور برقرار رکھنے کے اخراجات کم صارفین پر تقسیم ہوتے ہیں، جس سے بجلی مزید مہنگی ہو جاتی ہے۔

قیمتوں میں اضافے کے باعث مزید لوگ سولر نظام کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور یوں یہ سلسلہ ایک دائرے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ماہرین کے مطابق طویل مدت میں اس سے ایک دو سطحی نظام جنم لے سکتا ہے، جہاں سولر پینلز خریدنے کی استطاعت رکھنے والے افراد کم خرچ توانائی سے فائدہ اٹھائیں، جبکہ غریب اور کم آمدنی والے صارفین بڑھتے ہوئے بجلی کے بل ادا کرنے پر مجبور رہیں۔ اس کے ساتھ ہی قومی گرڈ کا مالی بوجھ بھی حکومت پر بڑھتا چلا جائے۔ محمد حسن داجانہ کے بقول، ’آخرکار آپ کے پاس ایک ایسا سرکاری نظام رہ جائے گا جو سفید ہاتھی بن چکا ہوگا اور محض اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے بڑے پیمانے پر سرکاری مالی معاونت کا محتاج ہوگا۔‘

کراچی کے گنجان آباد علاقے میں کئی گھروں کی چھتوں پر سولر پینلز نصب ہیں، منظر اوپر سے دکھائی دیتا ہے۔ ہموار چھتوں والے گھروں اور ٹیرس ڈھانچوں پر بڑے سولر نظام لگے ہوئے ہیں جبکہ نزدیک موجود رہائشی عمارتیں دھند آلود آسمان کے نیچے دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پیش منظر میں بجلی کی تاریں روایتی بجلی کے بنیادی ڈھانچے اور رہائشی شمسی توانائی کے نظاموں کے امتزاج کو نمایاں کرتی ہیں۔

حکومت کا کہنا ہے کہ قومی گرڈ سے صارفین کی بڑھتی ہوئی علیحدگی کی قیمت پہلے ہی ادا کی جا رہی ہے۔ وفاقی وزیرِ توانائی اویس لغاری کے مطابق گذشتہ دو برسوں کے دوران صارفین کے شمسی توانائی کی طرف منتقلی کے باعث گرڈ پر باقی رہنے والے صارفین پر سالانہ 500 ملین ڈالر سے زیادہ کا اضافی بوجھ پڑا ہے۔ اویس لغاری کا کہنا ہے کہ حکومت کا مقصد لوگوں کو سولر توانائی اپنانے سے روکنا نہیں بلکہ قومی گرڈ کو زیادہ مؤثر اور مسابقتی بنانا ہے تاکہ صارفین کو بہتر نرخوں پر بجلی فراہم کی جا سکے۔

ملک میں نجی بجلی پیدا کرنے والی کمپنیوں کو طویل عرصے سے ایسے مہنگے معاہدوں پر تنقید کا سامنا ہے جنھوں نے بجلی کے شعبے پر مالی دباؤ بڑھایا۔ تاہم بجلی پیدا کرنے والے اداروں کا مؤقف ہے کہ گرڈ کی ناقص دیکھ بھال اور نظامی کمزوریاں بھی بڑھتے ہوئے اخراجات کی بڑی وجوہات ہیں۔

اویس لغاری کے مطابق حکومت نے بیشتر بجلی خریداری معاہدوں پر دوبارہ مذاکرات مکمل کر لیے ہیں اور اب توجہ گرڈ کو زیادہ مؤثر بنانے، توانائی کے ضیاع میں کمی، بہتر ذخیرہ کاری اور نئی ٹیکنالوجی کے استعمال پر مرکوز ہے۔ حکومت کا ہدف ہے کہ 2036 تک پاکستان کی توانائی کا تقریباً 90 فیصد حصہ صاف ذرائع، بشمول قابلِ تجدید اور جوہری توانائی، سے حاصل ہو، جبکہ درآمدی ایندھن پر انحصار موجودہ 26 فیصد سے کم ہو کر صرف 4 فیصد رہ جائے۔







توانائی کے شعبے پر تحقیق کرنے والے ادارے ’رینیوایبلز فرسٹ‘ کے مطابق 2018 سے 2025 کے درمیان پاکستان میں شمسی توانائی سے پیدا ہونے والی بجلی کا حصہ ایک فیصد سے بڑھ کر 28 فیصد تک پہنچ گیا، جبکہ اب تقریباً 70 لاکھ گھرانوں میں سولر پینل نصب ہیں۔

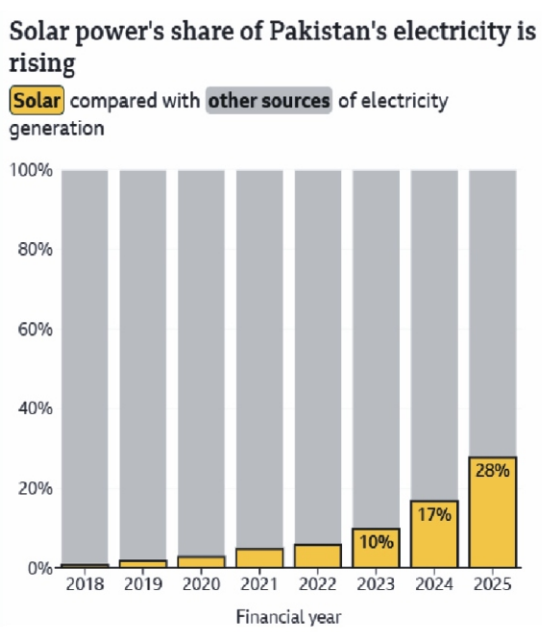

سولر سے چلنے والا کاروبار

حکومت ایک جانب قومی بجلی کے نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہی ہے، تو دوسری جانب صنعتی شعبہ بھی تیزی سے سولر توانائی کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ راولپنڈی میں واقع کوہِ نور ٹیکسٹائل ملز اس رجحان کی ایک نمایاں مثال ہے۔ مل کے وسیع احاطے میں پھیلے نیلے رنگ کے سولر پینلز دور تک دکھائی دیتے ہیں اور ادارے کی توانائی کی ضروریات کا بڑا حصہ پورا کرتے ہیں۔ مل کے یوٹیلٹیز مینیجر سباوون خان ان سولر پینلز کو اپنا ’بچہ‘ قرار دیتے ہیں۔ وہ مزید پینلز کی تنصیب کے لیے تیار کی جانے والی زمین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ سورج نکلنے کے بعد مل میں کام کرنے والی سینکڑوں مشینیں مکمل طور پر شمسی توانائی سے چلتی ہیں۔ ماضی میں کارخانہ بھاری فرنس آئل سے چلنے والے جنریٹروں پر انحصار کرتا تھا، مگر اب وہ انجن استعمال کے بجائے ایک گودام میں رکھے ہوئے ہیں۔ تاہم سولر توانائی کی اپنی حدود بھی ہیں۔ ابر آلود موسم، فضائی آلودگی یا رات کے اوقات میں بجلی کی پیداوار کم ہو جاتی ہے، جس کے باعث کمپنی کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے قومی گرڈ سے اضافی بجلی حاصل کرنا پڑتی ہے۔

اسی وجہ سے کمپنی، دیگر کئی صنعتی اداروں کی طرح، آئندہ ہفتوں میں صنعتی بیٹریوں کا استعمال شروع کر رہی ہے تاکہ دن کے وقت پیدا ہونے والی اضافی شمسی توانائی ذخیرہ کی جا سکے اور ضرورت کے وقت استعمال میں لائی جا سکے۔

مل کے چیف ایگزیکٹو آفیسر توفیق سعید سہگل کے مطابق سولر توانائی اختیار کرنے کا بنیادی مقصد پیداواری لاگت میں کمی لانا تھا۔ وہ کہتے ہیں، ’ہمیں اپنی توانائی کی لاگت کم کرنا تھی اور یہ اس کا ایک مؤثر طریقہ تھا۔‘ تاہم ان کے مطابق کمپنی کا مقصد قومی گرڈ سے مکمل طور پر الگ ہونا نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ’بدقسمتی سے ریاست کے پاس وسائل محدود ہیں، اس لیے ہم ہر مسئلے کا الزام حکومت پر نہیں ڈال سکتے۔ کچھ کام ہمیں خود بھی کرنا ہوتے ہیں، اور توانائی کے شعبے میں سرمایہ کاری انھی اقدامات میں سے ایک ہے۔‘ ایک کارکن ایک بڑے صنعتی پرنٹر کے پاس کھڑا ہے جبکہ وہ پھولوں کے بڑے ڈیزائن والا کپڑا تیار کر رہا ہے۔ رنگین کپڑے پر گہرے نیلے پس منظر میں گلابی، جامنی، سرخ اور سنہری پھول نمایاں ہیں۔

ناقدین حکومت پر الزام عائد کرتے ہیں کہ اس نے سولر توانائی کے معاملے میں قواعد بدل دیے ہیں۔ ماضی میں گھرانے اضافی بجلی گرڈ میں فراہم کر سکتے تھے اور اس کے بدلے کریڈٹ حاصل کرتے تھے، جنھیں بعد میں سورج نہ نکلنے کے اوقات میں گرڈ سے حاصل کی جانے والی بجلی کی لاگت کم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

(باقی صفحہ 15 پر)

تحریر: سلمان حبیب

⟨قسط نمبر 1⟩

مخزن کی تلاش

کہر اور تاریکی میں راوی قدیم عمارت میں ایک خون میں لت پت لاش ملی۔ وہ حملہ آوروں سے لڑ کر بھاگ نکلا اور کار سے فرار ہو گیا۔ ناکامی پر افسوس کرتے ہوئے وہ غفان حوری کے پاس جانے لگا۔

فضا پر دبیز کہر مسلط تھا ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس تاریکی میں یہ قدیم عمارت آسمان کی جانب سر اٹھائے سکوت کی بارش میں بھیگ رہی تھی، ساری کی ساری عمارت گہری تاریکی کا شکار تھی اور اس میں کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے کار اس عمارت کے پھاٹک پر روک دی اور اس کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا، ایک نگاہ میں نے اطراف میں چاروں طرف ڈالی ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ کسی انسان کی موجودگی کے آثار تصور تک ذہن میں نہیں آتے تھے۔

آخر کار میں پھاٹک کی جانب بڑھ گیا۔ اس وقت کوئی اگر مجھے دیکھتا تو یقیناً خوفزدہ ہو جاتا، میں نے ایک ڈھیلا ڈھالا اوور کوٹ پہنا ہوا تھا اور کہر اور گہری تاریکی میں ایک تاریک ہیولا ہی نظر آ رہا تھا، کوٹ کی لمبی جیب سے وہ چھوٹی سی ٹارچ نکالی جو چائنہ کی بنی ہوئی تھی، لیکن چائنہ کی صنعت کاری کا نمونہ اس ننھی سی ٹارچ سے روشنی کی ایک لکیر پھوٹی اور اس پھاٹک پر پڑی، تھوڑا سا گھمانے پھرانے کے بعد اس روشنی کا دائرہ کار بڑے سے پھاٹک پر جا کر ٹھہر گیا۔

میں نے کچھ لمحے اس تالے پر نگاہیں جمائے رکھیں اور پھر گردن ہلا کر آگے بڑھ گیا، اس کے بعد میں نے اپنے کوٹ کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول نما چیز نکالی، ٹارچ جلا کر اس کا رخ تالے کی جانب کیا، ایک نظر اسے دیکھا اور پستول نما چیز کا نشانہ تالے کو بنا لیا۔ جیسے ہی میں نے بٹن دبایا سبز رنگ کی تیز شعاعیں اس میں سے پھوٹنے لگیں اور تالے پر پڑنے لگیں چند ہی لمحوں کے بعد نتیجہ سامنے آ گیا، لوہے کا وہ بڑا سا تالا پگھل کر نیچے گر گیا اور میں نے پستول نما وہ چیز دوبارہ سے اپنی جیب میں ڈال لی، پھر آہستگی کے ساتھ پھاٹک کھول کر آہستہ سے میں کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا، اندر جا کر میں نے پھاٹک کو پہلے کی طرح بند کر دیا تا کہ اگر اس پر کوئی نگاہ دوڑائے تو اسے پھاٹک بند ہی نظر آئے۔ اس کے بعد میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا محتاط اور چوکنے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

عمارت کے صدر دروازے پر پہنچ کر میں رکا، اور پھر میں نے ٹارچ سے دوبارہ روشنی کر لی اور اس کا محدود دائرہ صدر دروازے پر چکرانے لگا۔ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا دروازے میں جنبش ہوئی اور وہ تھوڑا سا اندر کی جانب کھل گیا۔

میرے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی اور اس کے بعد میں نے دروازے پر اپنے ہاتھ کا پورا دباؤ ڈال دیا، دروازہ احتجاج کے بغیر کھلتا چلا گیا اور اس کے بعد میں اس دروازے سے اندر داخل ہو گیا، خاصا بڑا کمرہ نظروں کے سامنے ظاہر ہو گیا، میں نے چاروں طرف دیکھا اور اس کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو گیا، سب سے پہلے میں نے ٹارچ کی روشنی میں کھڑکیاں تلاش کر کے ان کے پردے برابر کئے اور اس کے بعد اندر روشنی تیز کر دی۔

میں کچھ لمحے تک ادھر ادھر کا جائزہ لیتا رہا اور پھر کمرے کے سامان کو تیزی سے الٹنا پلٹنا شروع کر دیا جس کے مجھے تلاش تھی وہ میرے چہرے پر امید کی ایک کرن بن کر چمک رہی تھی، لیکن اس کمرے کی تلاشی بے مقصد ثابت ہوئی اور میں یہاں سے آگے بڑھ کر دوسرے کمرے کی جانب چلا گیا، اس کمرے کا بھی تالا لگا ہوا تھا، لیکن میرے پاس اس کا معقول انتظام تھا، اس طرح کی چیزیں ایجاد کر لی گئی ہیں جو ایسے کاموں میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں ایک بار پھر میں نے وہی پستول نما چیز نکالی۔ ٹارچ جلا کر اس کا رخ تالے کی جانب کیا اور پھر بٹن کو دبا دیا۔ جیسے ہی بٹن دبایا اس میں سے شعاعیں پھوٹ پڑیں اور کچھ لمحوں کے بعد یہ تالا بھی کھل گیا۔ کمرے کے دوسرے حصے میں روشنی کے بٹن تھے، میں نے وہ کمرہ بھی روشن کر دیا، یہ شاید کوئی ریڈنگ روم تھا، کمرے میں چاروں طرف شیلف اور ریک بنے ہوئے تھے۔ جن میں لاتعداد کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا اور اس کے بعد اس میز کی درازوں کو بھی کھول کر دیکھا جو سامنے رکھی ہوئی تھی، لیکن آہستہ آہستہ میرے دل میں مایوسی اترنے لگی، کیا کرنا چاہئے مجھے کیا کروں اور کیا نہ کروں، آخر کار میں نے کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیں، ممکن ہے کسی کتاب یا شیلف میں میری مطلوبہ چیز پوشیدہ ہو، میں ہر کتاب کی ورق گردانی کر کے اسے نیچے پھینکنے لگا، ذرا سی دیر میں ایک اور شیلف خالی ہو گیا، اس پر رکھی کتابیں اب بے ترتیبی سے فرش پر پڑی ہوئی تھیں۔

ایک بار پھر میں اسی میز پر جھک گیا، لیکن بیکار، وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا پھر میں اس کمرے سے بھی باہر نکل آیا، اس کے بعد میں ایک ایسے کمرے میں داخل ہو گیا جس کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا، میں بے دھڑک اس میں داخل ہو گیا اس میں گھستے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے، میں نے سوئچ آن کیا تو میں نے دیکھا کہ ہر کھڑکی کے پردے پہلے ہی سے کھنچے ہوئے ہیں اس طرح کہ روشنی کی کوئی کرن باہر نہ جا سکے۔

جیسے کوئی اور ہی خاص بات ہو، جیسے ہی کمرے میں تیز روشنی پھیلی میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میرے سامنے ایک لاش پڑی ہوئی تھی، جو خون میں لت پت تھی، لاش تازہ ہی تھی گوشت کے بھنچے ہوئے عضلات سے ظاہر تھا کہ اسے شاید ابھی کچھ دیر پہلے ہی قتل کیا گیا ہوگا، میرا سر چکرانے لگا اور یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا قصہ ہو سکتا ہے بہرحال اپنے اعصاب پر قابو پانے کے بعد میں نے جھک کر اس لاش کو دیکھا مجھے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

لاش تقریباً چالیس سالہ شخص کی تھی جو اچھے خاصے مضبوط جسم کا مالک تھا اور کافی طاقتور نظر آتا تھا، لیکن اسے قتل کر دیا گیا تھا، سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ پھر رات کے سناٹے میں کہیں سے کچھ آوازیں ابھریں اور میں نے جلدی سے جان بچانے کا فیصلہ کر لیا، ایک لمحے کے اندر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں شدید خطرہ ہے، میں نے کار بھی گیٹ کے بالکل سامنے کھڑی کی تھی لیکن بہرحال میں بالکل بیوقوف نہیں تھا، جرم کی دنیا سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اب تو یہ سب کچھ ایک جرم ہی کی حیثیت رکھتا ہے، میں نے دل میں سوچا اور اس کے بعد اپنی تمام تر ذہانت میں نے یہاں سے واپس پلٹنے کے لئے صرف کر دی۔

میں گیٹ کی طرف جانے کے بجائے عمارت کی چار دیواری کے عقبی حصے میں پہنچا اور یہ جائزہ لینے کی کوشش کی کہ اگر میں عقبی حصے سے باہر نکلنے کی کوشش کروں تو کامیابی ہو سکتی ہے یا نہیں، میں یہ سوچ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور آخر کار عقبی دیوار پر چڑھ کر میں نے دوسری جانب چھلانگ لگا دی لیکن وہ جو کہتے ہیں ناں کہ سر منڈھواتے ہی اولے پڑ گئے اچانک ہی کسی نے مجھے دبوچ لیا۔

میں ایک لمحے تک تو بھونچکا رہ گیا تھا، لیکن دوسرے ہی لمحے میں دبوچنے والے سے گتھم گتھا ہو گیا، البتہ چند ہی لمحوں کے بعد میں نے اس پر قابو پا لیا۔ لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تنہا نہیں تھا اور مسلح بھی تھا، میں نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا تھا اور اس کی اچھی خاصی ٹھکائی کر ڈالی، لیکن اس نے اچانک ہی جیب سے ریوالور نکال لیا اور اس سے پہلے کہ وہ ریوالور سیدھا کر کے مجھ پر فائر کرتا میں نے ایک بھرپور ضرب اس کے جبڑے پر لگائی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا، البتہ اس نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی وہ مجھے سنبھلنے سے پہلے ہی دبوچ لینا چاہتا تھا، جیسے ہی وہ اڑتا ہوا میرے قریب پہنچا میں نے دونوں پاؤں اٹھا کر اس کے پیٹ پر مارے، وہ بری طرح چیخا اور پھر پیٹ تھام کر پیچھے کی طرف بیٹھا، میرے لئے اتنی ہی مہلت کافی تھی، میں نے اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا اور مشینی انداز میں اس پر لاتیں اور گھونسے برسانے لگا، اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی یہ کوشش میں نے ناکام بنا دی۔

وہ کچھ دیر تک تو پٹتا رہا اور پھر اس کے حلق سے ہلکی ہلکی چیخیں نکلنے لگیں، لیکن اسی وقت کسی نے عقب سے میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر گردن پر جمانے کی کوشش کی، مگر میں جانتا تھا کہ اس کے نتیجے میں کیا ہونا چاہئے۔ میرے پاؤں کی ایڑھی پیچھے سے اس کے پیٹ پر پڑی اور وہ بھی چیخ پڑا۔ اس کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی، اور میں مسلسل اس کی پٹائی کر رہا تھا، لیکن میری کوشش یہی تھی کہ میں یہاں سے نکل جاؤں اور میں یہی سوچ کر دیوار کے ساتھ ساتھ مین گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا، یہاں تک کہ میں گیٹ تک پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے اچھل پڑا کہ میری کار اسی جگہ موجود ہے۔

میں نے جیب میں کار کی چابی تلاش کی کہیں اس بھاگ دوڑ میں میری کار کی چابی نہ گر گئی ہو، جس طرح میں نے ان لوگوں کی مرمت کی تھی اس سے وہ لوگ شاید خوفزدہ ہو گئے تھے، چنانچہ مجھے کار تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی، خوف صرف اتنا تھا کہ ان کے پاس پستول وغیرہ موجود تھا وہ عقب سے مجھے پر فائرنگ ضرور کریں گے لیکن بہرحال میں نے دروازہ کھولا اور اس کے بعد برق رفتاری سے کار کی سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی اور پھر اندھا دھند کار دوڑانے لگا۔

راستے تاریک اور خوفناک تھے، لیکن اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ اس وقت جتنی تیزی سے گاڑی کو بھگا سکتا ہوں بھگاؤں، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد میں اس عمارت سے دور نکل آیا، لیکن میرے ذہن پر ایک بوجھ سا طاری تھا، میں اپنی اس ناکامی پر افسوس کر رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے حیرت بھی تھی۔

اب جو کچھ بھی ہے بہرحال مجھے اس وقت سیدھے غفان حوری کے پاس پہنچنا چاہئے، مین سڑک پر آ کر میں نے کار کی رفتار سست کر دی اور سست روی سے چلتا ہوا شہر کی جانب جانے لگا۔ بہرحال یہ سب معمول سے ہٹ کر تھا اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں اب اس طرح کے کاموں میں ماہر ہوتا جا رہا ہوں۔

میری زندگی کی کہانی عام لوگوں کی کہانیوں سے الگ کہانی نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح دنیا میں لوگ حادثات کا شکار ہوتے ہیں میں بھی اسی طرح کا ایک انسان تھا، تین بہنیں تھیں، ماں تھی اور میں تھا باپ کا انتقال اس دور میں ہو چکا تھا جس دور میں باپ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ تعلیم پتہ نہیں کس کس طرح حاصل کی، ایم ایس سی کر لیا، اس میں ماں کی مدد بھی شامل تھی اور بہنوں کا پیار بھی، تینوں بہنوں میں سے ایک بہن مجھ سے ایک سال بڑی تھی، باقی دو مجھ سے دو اور تین سال چھوٹی تھیں۔ کیونکہ گھر کے حالات بہت ہی تنگ دستی کے تھے، اس لئے محبتوں کا وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا تھا جو خوشحال گھروں میں ہوتا ہے۔ بہنیں بھی اپنے اپنے طور پر زندگی گزار رہی تھیں، نوکریاں کرتی تھیں، ماں بیمار ہو گئی تھی، بعد میں پتہ چلا کہ وہ کینسر کا شکار ہے، وہ کمزور ہوتی چلی گئی، جسم پر صرف کھال ہڈیوں پر منڈھی رہ گئی اور آخر کار ماں نے دل توڑ دیا۔

ماں کے علاج کی بہت سی راہیں تھیں لیکن سیدھا راستہ وہ رقم تھی جو اس کے علاج پر خرچ ہوتی اور جسے میں مہیا نہیں کر سکا تھا، اس کا احساس میری تینوں بہنوں کو بھی تھا۔

منجھلی بہن کبھی کبھی دبے الفاظ میں کہہ دیا کرتی تھی کہ باپ تو خیر اللہ کے حکم سے اپنی زندگی پوری کر کے چلے گئے، لیکن ماں کا اگر ویسا ہی علاج ہو جاتا تو زندگی مل سکتی تھی، اس بات پر چھوٹی بہن اکثر میری حمایت میں بول پڑتی تھی۔

''اکیلا بھائی ہے، وہ اپنی ہی زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہے، کسی کے لئے کیا کر سکتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے پوری وفاداری اور ایمانداری کے ساتھ زندگی کے اس مقام کی تلاش جاری رکھی تھی جو انسان کو اتنا خوشحال ضرور کر دیتا ہے کہ وہ کم از کم اور کچھ نہیں تو اپنے چھوٹے سے گھر کو ہی چلا سکے، بہنوں کی شادی اور ان کی ضرورتیں پوری کرنے کا کوئی ذریعہ میرے ہاتھ نہیں آ سکا تو میرا ذہن بھی غلط راستوں کی طرف بھٹکنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ دنیا میں لاتعداد لوگ جو خوشحال زندگی گزار رہے ہیں ان کے ذرائع آمدن بہتر نہیں ہیں، بہت سے لوگوں سے رابطے بھی رہے اور میں نے خود بھی کوشش کی میرے پاس وہ ذرائع آمدنی پیدا ہو سکیں لیکن تقدیر نے ساتھ نہیں تھا، بہنیں مجھ سے متنفر ہوتی چلی گئیں اور اب گھر میں میری حیثیت ایک بے نام پتھر کے ٹکڑے کی طرح سے تھی

نہ کوئی کسی کی توجہ تھی نہ کسی کی محبت اور مہربانی، گھر جاتا، خود ہی اپنا کھانا نکالتا، یہ کھانا پینا بھی بہنوں ہی کا مرہون منت تھا، وہ کماتی تھیں اور ان کی کمائی کا تھوڑی بہت حصہ مجھے بھی مل جاتا تھا، بدنصیبی تھی، بدنصیبی یہ تھی کہ میں نے کوئی غلط کام ابھی تک نہیں کیا تھا، لیکن اب میرا ذہن غلط کاموں کی سمت بھٹکنے لگا تھا۔

لوگوں سے مختلف مشورے لیتا رہتا تھا، زیادہ تر میرے جیسے ہی دوست میرے ساتھی تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے تعلیم حاصل کر لی تھی، اور یہ علم ایسی بھیانک چیز ہے کہ یہ انسان کو پتہ نہیں کیا کچھ دے دیتا ہے۔ پھر ایک دن مجھے ایک کردار ملا جو بہت ہی عجیب تھا۔

میں ایک جھونپڑا نما چائے خانے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور اخبار بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا، پستہ قامت بکھرے بال اچھا تندرست بدن، چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت تھی اس نے کہا۔

''یقیناً تمہارے پاس دوسری چائے کے پیسے بھی ہوں گے، مجھے چائے پلاؤ گے؟''

میں نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور پھر ویٹر کو ایک اور چائے لانے کا اشارہ کر دیا، ویٹر نے چائے کی گندی پیالی ہمارے سامنے رکھ دی تو اس شخص نے میرا شکریہ ادا کیا اور بولا۔

(جاری ہے)

شام کے سائے تلے

تحریر: بسمیٰ راحت

(قسط نمبر 123)

.....گذشتہ قسط کا آخری پیراگراف)

ندرت بری طرح مسحور ہوگئی تھی۔ وہ ردا کی صورت دیکھ رہی تھی۔ ردا کے چہرے پر نجانے اس وقت کیسے کیسے کنول کھلے ہوئے تھے۔ ندرت نے آہستہ سے کہا۔

''ردا یہ سب کچھ ممکن نہیں ہوسکے گا، کیوں ایسی باتیں کررہی ہو میری مسکراہٹیں بھی چھین لینا چاہتی ہو تم، پلیز ردا پلیز...اس سلسلے میں کوئی بہت بڑا قدم اٹھانے کی کوشش مت کرنا میں جانتی ہوں یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔''

''یہ سب ہوگا ندرت، یہ سب کچھ ہونا چاہئے اور اگر نہ ہوسکا تو میں اسے دو انسانوں کی شدید بدنصیبی قرار دوں گی، بس اتنا کافی ہے اور تو ایک بات کا اطمینان رکھ۔ اگر تو چاہے گی تو میں دنیا کے کسی دوسرے فرد سے اس کا تذکرہ نہیں کروں گی اس وقت تک جب تک کہ اس لئے کوئی مناسب حل نہ نکل آئے۔''

''ہوں مونالیزا، خدا کی قسم خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تو اتنی خطرناک نکلے گی، ارے باپ رے تو تو...تو تو...''

''بس بس مجھے خوشیوں میں ڈوبا رہنے دے کم از کم میں اختر کو اب یہ جواب دے سکوں گی کہ اس کے دل کی دنیا ویران نہیں ہوگی۔''

''ہوں تو سوال وجواب کا یہ سلسلہ بھی جاری رہے گا۔''

''کیوں نہیں، میں اختر کو لکھ کر آگاہ کروں گی، اس تک یہ بات ضرور پہنچاؤں گی''

''اور اگر تمہاری وہ تحریر اس کے والد کے ہاتھ لگ گئی تو...''

(آگے پڑھیئے)

''نہیں میں ابھی اس وقت تک کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گی جب تک کہ اختر یا ان لوگوں کی طرف سے کوئی آغاز نہ ہو۔''

''مگر یہ آغاز کیسے ہوگا؟'' ندرت نے بے اختیارانہ انداز میں کہا اور رداہنس پڑی۔

''ہوجائے گا پریشان مت ہو۔''

''میرا مقصد یہ تھوڑی ہے میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اگر تم تم...کیا فضول بکواس ہے بس اب میں چلتی ہوں، جھاڑو لگانی ہے، اماں بی جوتی لئے بیٹھی ہوں گی۔'' ندرت نے کہا اور رکے بغیر تیزی سے وہاں سے چل پڑی، ردا محبت بھری گناہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

معمولات زندگی جوں کے توں جاری تھے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی لیکن اس شام پرسکون کوٹھی کی فضاء میں کچھ ہلچل پیدا ہوگئی، احسان صاحب گھر کے معاملات سے بری الذمہ آدمی تھے، یہاں کی تمام ذمے داریاں گھر والوں نے سنبھالی ہوئی تھیں اور وہ زیادہ تر کاروباری امور میں مصروف رہتے تھے، شام کو تقریباً سات بجے وہ گھر پہنچے تو ان کے چہرے پر پریشانی کی جھلکیاں تھیں، انہوں نے کوٹھی کے صدر گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی پورچ پر نگاہیں دوڑائی تھیں نجانے کیا تلاش کیا تھا انہوں نے۔ پھر گاڑی سے اتر کر وہ سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے، ایک ملازم کو طلب کیا اور اس سے پوچھا۔

''شہاب کہاں ہیں؟''

''جی شہاب صاحب تو دوپہر سے گئے ہوئے ہیں۔''

''ہوں ذرا ذکیہ کو بھیج دو میرے پاس'' انہوں نے کہا اور ملازم گردن خم کرکے چلا گیا، ذکیہ بیگم خود ہی آنے والی تھیں، ملازم نے طلبی کی اطلاع دی تو ذرا تیز قدموں سے شوہر کے کمرے میں پہنچ گئیں اور ہمیشہ کی مانند مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھا، لیکن ایک لمحے ہی میں ذکیہ بیگم کو احساس ہوگیا کہ احسان صاحب کچھ پریشان ہیں۔

''ذکیہ شہاب کہاں ہے؟''

''پتہ نہیں دوپہر سے گئے ہوئے ہیں کھانے کے بعد نکل گئے تھے کیوں خیریت تو ہے''

''اوں..شاید خیریت نہیں ہے ذکیہ'' احسان صاحب نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خدا خیر کرے کیا بات ہے پریشان نظر آرہے ہیں اللہ نہ کرے شہاب کو....''

''نہیں ابھی تو کچھ نہیں ہوا ہے میں تو خود اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، وہ کہاں ہے کسی کو اطلاع ہوتی ہے اس کے بارے میں؟''

''نہیں کبھی ضرورت ہی نہیں پیش آئی''

''اوہ ذکیہ، جو کچھ میں تم سے پوچھ رہا ہوں اس کی تشہیر نہیں ہونی چاہئے اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے دل میں کسی قسم کا خیال نہیں لاؤ گی''

''کیا بات ہے آپ نے اس لہجے میں آج تک کبھی گفتگو نہیں کی، میرا دل ہول رہا ہے''

''احمقوں کی سی باتیں مت کرو، بھلا دل ہولنے کا کیا سوال ہے، میں تمہارے سامنے زندہ سلامت موجود ہوں، گھر کے معاملات پرسکون ہیں میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب پوری سمجھ داری سے دینا۔'' ''ہاں ہاں پوچھئے''

''زمان کا انتقال ہوگیا، ان کے ذرائع آمدنی کچھ اچھے نہیں تھے، ظاہر ہے ان کے انتقال کے بعد رشید کی پرورش بھی بہتر طور پر نہیں ہوئی ہوگی، فیصل آباد میں ان لوگوں کے مالی وسائل کیا تھے، تمہارے علم میں ہے کچھ؟''

''کوئی خاص مالی وسائل نہیں تھے، پریشان ہوکر ہی طفیلی بیگم نے مجھے خط لکھا تھا، مگر کیا ان کی کوئی بات ہے؟''

''ہاں ان کی ہی ہے، رشید ہے کہاں آج کل، کوٹھی میں نہیں ہے۔''

''نہیں کئی دن سے نہیں ہے، طفیلی بیگم بتا رہی تھیں کہ کسی کام سے ملک سے باہر گیا ہوا ہے

''وہ کام کیا تھا، کیا طفیلی بیگم نے اس کا تذکرہ کبھی تم سے کیا؟''

''نہیں کہہ رہی تھیں شہاب میاں کے کاروبار میں شریک ہوگیا ہے اور انہی کے حکم سے باہر گیا ہے۔''

''تم نے یہ نہیں پوچھا ذکیہ بیگم کہ شہاب کا کیا کاروبار ہے شہاب تو کچھ بھی نہیں کرتے؟''

''نہیں میں اتنی گہرائی میں نہیں گئی، اور پھر میں نے کبھی کبھی یہ بھی سنا ہے شہاب تھوڑا بہت کچھ کرلیا کرتے ہیں کیا کرتے ہیں اس کے پوچھنے کی کبھی ضرورت نہیں پیش آئی۔''

''ذکیہ معاملہ بہت الجھا ہوا ہے اور اس میں خدانخواستہ ہم سب بھی ملوث ہوسکتے ہیں ذرا ایک کام کرو تم خود طفیلی بیگم کے پاس چلی جاؤ ان سے پوچھو کہ رشید نے ان سے جاتے ہوئے کیا کہا ہے کیا انہیں یہ بات معلوم ہے کہ وہ کہاں گیا ہے اور کیوں گیا ہے؟''

''میں مزید پوچھے لیتی ہوں لیکن طفیلی نے یہی بتایا ہے کہ وہ شہاب میاں کے کہنے ہی پر کہیں گیا ہے اور اللہ رکھے اب اچھا خاصا کمارہا ہے

''ہوں گویا جو کچھ سنا میں نے وہ سب سچ ہے، ذرا طفیلی بیگم کو بلوالو۔''

''ٹھیک ہے میں ابھی بلواتی ہوں''

''تم نہیں جاؤ بھئی، کسی ملازم سے بلوالو' احسان صاحب نے کہا اور ذکیہ بیگم نے فوراً ہی باہر نکل کر ایک ملازم سے طفیلی بیگم کو بلانے کے لئے کہا تھوڑی دیر کے بعد طفیلی بیگم ہانپتی کانپتی اندر آگئیں اس سے پہلے کبھی ایسا موقع نہیں ہوا تھا کہ احسان صاحب کے کمرے میں ان کی طلبی ہوئی ہو، احسان صاحب نے خود ہی انہیں سلام کیا تھا۔

''بیٹھیئے طفیلی بہن، کیسے مزاج ہیں آپ کے۔'' احسان صاحب کا لہجہ نرم تھا۔

''ٹھیک ہوں بھائی صاحب مجھے بلایا تھا آپ نے۔'' طفیلی بیگم کی آواز پریشان سی تھی۔

''ہاں طفیلی بیگم کچھ ایسی ہی ضرورت پیش آگئی ہے کہ مجھے آپ کو تکلیف دینا پڑی رشید کے بارے میں آپ کو کچھ علم ہے کہ کہاں گیا ہے؟''

''اللہ رکھے ملک سے باہر گیا ہے، کہہ رہا تھا کہ اماں بس اب پرواہ مت کر، دولت کے انبار لگادوں گا خود کو اپنے خاندان کے برابر ثابت کرکے دکھادوں گا، ویسے بڑا محنتی بچہ ہے احسان بھائی، باپ کی موت کے بعد اسی نے جو کچھ تھا سنبھالا ہوا تھا۔'' طفیلی بیگم بولیں۔

''اس کی صحبتیں کیسی رہیں طفیلی بیگم؟''

''کیا وہ آپ کو یہ بتا کر نہیں گیا طفیلی بیگم کہ وہ کہاں اور کس مقصد کے لئے جارہا ہے۔''

''شہاب میاں نے بھیجا ہے کہیں یہی کہہ رہا تھا کہ کوئی کاروباری سلسلہ ہے، شہاب صاب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا ہے اور کیوں نہ رکھیں اپنا بچہ ہے، اپنا خون ہے، آپ ہی لوگ اسے نہ سنبھالیں گے تو اور کون سنبھالے گا، زمان زندہ رہے تو ان کے دل میں کدورت ہی رہی، لیکن بھیا میرا اس کدورت سے کوئی واسطہ نہیں تھا، میں نے تو گھرانے کی ایک اچھی عورت کی طرح زمان کا ساتھ نبھادیا، جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو میرے دل میں بہن کی محبت جاگی اور میں اپنے بچے کو لے کر یہاں چلی آئی۔ احسان بھائی بڑے احسانات ہیں آپ کے ہم لوگوں پر اور بڑی فراخدلی ہے آپ کی زمان سے

تفسیر شہاب کا جگری دوست تھا، اگر اسے اسٹیشن پر رسیو نہ کیا جاتا تو بگڑ جاتا، اس لئے نجانے کتنے عرصے کے بعد شہاب نے ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھا تھا۔ سیاہ چادر گیٹ سے نکلی، ٹکٹ چیکر جگہ چھوڑ چکا تھا اس لئے گیٹ خالی پڑا تھا



''کبھی کوئی شکایت سننے کو نہیں ملی بھائی صاحب اس کی آج تک، ویسے بھی بڑی محبت کرتا ہے آپ سب لوگوں سے۔''

''میں یہ تمام باتیں نہیں پوچھ رہا، میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کا کردار کیسا رہا ہے، غلط صحبتوں میں تو نہیں رہا۔''

''نہیں بھائی صاحب، زمان کی اولاد کبھی خراب نہیں ہوسکتی۔'' طفیلی بیگم نے کہا اور پھر چونک کر بولیں ''مگر یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو بھیا، خیریت تو ہے نا، کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔''

اختلاف کے باوجود رشید کو اپنے گلے لگایا، میں اسے ہمیشہ کے لئے آپ کی غلامی ہی میں دینا چاہتی تھی اور یہ بات بہت دن سے میرے دل میں مچل رہی تھی پر کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، میں نے سوچا تھا کہ رشید کچھ بن جائے گا تو آپ سے تذکرہ کروں گی۔''

''کیسا تذکرہ؟'' احسان صاحب کی آواز میں کچھ غراہٹ پیدا ہوگئی۔

''ابھی کچھ نہیں کہوں گی احسان بھائی وقت آنے پر سب کچھ کہوں گی۔''

''جائیے آپ اپنے کمرے میں جائیے'' احسان صاحب نے کہا اور طفیلی بیگم چونک کر انہیں دیکھنے لگیں، احسان صاحب طفیلی بیگم کی باتوں کا مقصد کچھ کچھ سمجھ گئے تھے، ذکیہ بیگم بھی حیران تھیں، طفیلی بیگم نے باری باری دونوں کی صورت دیکھی اور بولیں۔

''کوئی غلط بات نکل گئی میرے منہ سے'

''طفیلی بیگم آپ اپنے کمرے میں واپس جائیے۔'' احسان صاحب پھر بولے۔

''جارہی ہوں بھائی، آپ ہی نے بلایا تھا لیکن آپ کا لہجہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا، ذکیہ بہن کچھ بتا تو دو مجھے کہ میری یہ طلبی کیوں ہوئی تھی۔''

''آپ جائیے طفیلی بیگم آپ جائیے''

''کمال کی بات ہے بلایا اور پھر اس طرح بھگا رہے ہو، ارے بھیا اگر کوئی بات بری لگ گئی ہو تو معافی چاہتی ہوں، میں ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہوں، لیکن رشتہ بھی ہے میرا کم از کم یہ لہجے تو اختیار نہ کرو کہ میرا دل پریشان ہی رہے۔''

''نہیں طفیلی بیگم، آپ اس لہجے کا برا نہ مانیں، لیکن آپ نے جو باتیں شروع کردیں وہ میری سمجھ میں نہیں آرہیں، کیا کچھ اور وضاحت کریں گی اس کی۔'' احسان صاحب بولے۔

''بھیا ہمت توڑ دی تم نے، اب کیا وضاحت کروں، اب تو جبھی زبان کھولوں گی جب میرا رشید کچھ بن کر دکھادے گا۔ کیا سمجھے؟'' طفیلی بیگم نے کہا اور دروازے سے باہر نکل گئیں، احسان صاحب غصیلی نگاہوں سے دروازے کو دیکھتے رہے، پھر ذکیہ بیگم کو گھورتے ہوئے بولے۔

''یہ کیا بکواس کررہی تھیں؟''

''خدا جانے میری سمجھ میں تو خود کچھ نہیں آرہا نجانے کیا کہنا چاہتی تھیں؟''

''آپ کو ان کے الفاظ کا مفہوم سمجھ لینا چاہئے ذکیہ بیگم۔''

''کچھ کچھ تو سمجھ رہی ہوں لیکن طفیلی بیگم کی یہ جرأت کس طرح ہوئی یہ میں نہیں جانتی۔''

''آپ کو جاننا چاہئے ذکیہ بیگم یہ گھر ہے چڑیا گھر نہیں، میں نے یہاں اپنے رشتے داروں کے لئے دروازے کھول دیئے ہیں لیکن کوئی سر پر سواری کرنے لگے تو میں اسے کسی قیمت پر برداشت نہیں کروں گا۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جس شخص سے آپ کو اختلاف ہو بھلا مجھے اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے، آپ ہی کی ہدایت تھی کہ کسی غریب رشتے دار کو ٹھکرایا نہ جائے، کیونکہ یہ سب کچھ خدا کی دین ہے اور اس دین کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچنا چاہئے''

''ٹھیک ہے لیکن حد سے آگے بڑھنا بھی تو مناسب نہیں ہے'' احسان صاحب نے متعدل ہوتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''مگر معاملہ کیا ہے کچھ بتایئے تو مجھے؟''

''قبل از وقت ہوگا'' احسان صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''آپ کی مرضی، میں نے کبھی آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا، لیکن بہرطور شرعی طور پر بھی حق رکھتی ہوں اور آج تک جس طرح اپنا کردار نبھاتی رہی ہوں اس کے تحت بھی میرا خیال ہے آپ مجھ سے بدظن نہیں ہوں گے''

''ارے نہیں نہیں ذکیہ، کیسی باتیں کرنے لگیں، دراصل اتنا پریشان ہوں کہ بتا نہیں سکتا رشید گرفتار ہوگیا ہے۔''

''کیا مطلب کہاں کیسے؟''

''سنگاپور میں ایک بہت بڑے جرم میں ملوث پایا گیا ہے۔ وہ ہیروئن کا بہت بڑا ذخیرہ لے کر سنگاپور گیا تھا اور اس ذخیرے کا تعلق اس کا تعلق''

''ہاں ہاں اس کا تعلق۔''

''میرا خیال ہے بس اتنا رہنے دو، اور سنو رشید کی گرفتاری کی خبر ابھی عام مت کرنا، طفیلی بیگم آسمان سر پر اٹھالیں گی، پوری کوٹھی میں ہنگامہ کردیں گی، میں نہیں چاہتا کہ ابھی یہ بات منظر عام پر آئے۔'' (جاری ہے)



ری جینریٹو فارمنگ: چھوٹے کسانوں کے لیے اُمید کی ایک کرن کیسے بنا؟

ڈھائی ایکڑ زمین میں قابل کاشت 16 کنال رقبے پر اب 1500 پھلدار درخت ہیں، ان میں مختلف پھلوں کی 46 اقسام ہیں، موسمی اور بے موسمی تقریباً تمام سبزیاں اگتی ہیں۔ اس سب کے درمیان وہ سالانہ مختلف اقسام کے ڈھائی لاکھ کے قریب سجاوٹی پھول کاشت کر رہے ہیں

.....میگزین رپورٹ.....

چار سال قبل ان کی ڈھائی ایکڑ زمین پر محض ایک 'فارم ہاؤس' تھا۔ اس پر چند رہائشی کمرے بنے تھے اور کبھی کبھار گھر کے استعمال کے لیے کچھ فروٹ اور سبزیاں آ جاتی تھیں۔ باقی تمام زمین بنجر تھی۔ میاں عبدالرؤف پیشے کے اعتبار سے سپریم کورٹ کے وکیل ہیں اور اسلام آباد کے مضافات میں لہتر اروڈ پر واقع یہ جگہ ان کے لیے محض 'شہر کی زندگی سے فرار کا ایک ذریعہ تھی۔' لیکن چار سال بعد یہاں کا منظر یکسر بدل چکا ہے۔ ڈھائی ایکڑ زمین میں قابل کاشت 16 کنال رقبے پر اب 1500 پھلدار درخت ہیں، ان میں مختلف پھلوں کی 46 اقسام ہیں، موسمی اور بے موسمی تقریباً تمام سبزیاں اگتی ہیں۔ اس سب کے درمیان وہ سالانہ مختلف اقسام کے ڈھائی لاکھ کے قریب سجاوٹی پھول کاشت کر رہے ہیں۔ اسی جگہ پر ایک چھوٹا سے پولٹری فارم اور بطخوں کے فارم کے علاوہ انگورہ نسل کے خرگوشوں کا ایک فارم بھی موجود ہے۔ ان جانوروں کے لیے خوراک بھی فارم ہی پر اگتی ہے۔ اسی بظاہر چھوٹی سی زمین تمام تر کاشت کے درمیان دو ٹنل بھی بنائے گئے ہیں۔ چائنیز طرز کی ٹنل میں بے موسمی سبزیاں اگائی جاتی ہیں اور دوسرے ٹنل میں بیش قیمت پھولوں کی فصلیں ہوتی ہیں۔

میاں عبدالرؤف کے فارم کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں تمام تر فصلیں 'ری جنیریٹو' یعنی قدرتی طریقے سے لی جاتی ہیں، کسی کیمیکل کھاد یا کیڑے مار دوا کا استعمال نہیں ہوتا۔ کمپوسٹ یعنی قدرتی کھاد وہ اپنے فارم پر ہی بناتے ہیں۔ اس زمین کے ٹکڑے کو بنجر سے سرسبز زرعی فارم بنانے والے زرعی سائنسدان ڈاکٹر محمد عظیم خان کہتے ہیں کہ چار سال قبل جو بارانی زمین ناہموار اور بنجر تھی 'وہ جلد سالانہ ستر سے اسی لاکھ روپے کمانے کے لیے تیار ہوگی۔' وہ سمجھتے ہیں کہ میاں عبدالرؤف کا قدرتی طریقہ زراعت اور سائنسی بنیادوں پر قائم یہ فارم پاکستان کے دوسرے کسانوں کے لیے ایک ماڈل ہوسکتا ہے۔ خاص طور پر چھوٹے کسان جن کے پاس زمین کم ہے وہ اس ماڈل سے مستفید ہوسکتے ہیں۔

ناہموار اور بنجر زمین پر یہ فارم بنا کیسے؟

میاں عبدالرؤف کے فارم کے اردگرد کی زمین دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ چار سال میں ان کی زمین پر آنے والی تبدیلی درحقیقت کتنی بڑی ہے۔ ان کے فارم کی چار دیواری کے ارد گرد حد نگاہ تک پھیلی زمین ناہموار علاقہ ہے اور دور کہوٹہ کی پہاڑیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ تمام تر بارانی زمین ہے جس پر قدرتی گھاس اگی ہوئی ہے۔ بارش کا پانی مختلف قدرتی نالوں کی شکل میں بہتا ہے۔ میاں عبدالرؤف نے بتایا کہ وہ یہاں صرف ہفتہ وار چھٹی پر دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے آتے تھے۔ کرونا کی وبا کے دنوں میں جب ان میں وائرس کی تصدیق ہوئی تو انھوں نے قرنطینہ کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا۔ 'میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کچھ پھل اور سبزیاں آ جاتی تھیں جو میرے گھر والے اور چند دوست احباب استعمال کرتے تھے۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب آئے تو انھوں نے جو آئیڈیا دیا اس نے اس کو بالکل ہی بدل کے رکھ دیا۔ یہ چار سالوں میں انہونی سی ہوگئی ہے۔'

ان کا اشارہ ڈاکٹر محمد عظیم کی طرف ہے۔ ڈاکٹر عظیم پاکستان ایگریکلچر ریسرچ کونسل کے سابق چیئرمین ہیں جو نیشنل ایگریکلچر ریسرچ کونسل اور پلاننگ کمیشن سمیت کئی اداروں میں نمایاں عہدوں پر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ انھوں نے میاں عبدالرؤف کی زمین پر ایسا ماڈل فارم بنانے کے لیے لگ بھگ ڈھائی ایکڑ کا انتخاب کیا جس میں سے 16 کنال کے قریب قابل کاشت ہے۔ باقی پر تعمیرات ہیں۔ اس وقت یہ جگہ ناہموار ڈھلوان تھی اور اس پر آبپاشی کے لیے پانی کا بندوبست نہیں تھا۔ ڈاکٹر عظیم کہتے ہیں کہ انھوں نے پہلے مشینوں کی مدد سے کھدائی کروا کے اس جگہ کو ہموار کیا۔ اس کے بعد اس فارم کو پہلے کاغذ پر ڈیزائن کیا گیا۔ 'یہ میری چالیس سالہ پبلک سروس تجربے کا نچوڑ سمجھ لیں۔ جو کچھ میں نے سیکھا رکھا تھا وہ یہاں لا گو کیا۔'

زمین پر پانی کہاں سے آیا اور سینکڑوں درخت کیسے ممکن ہوئے؟

ڈاکٹر محمد عظیم نے بتایا کہ انھوں نے فارم کے لیے زمین کے ایک ایسے ٹکڑے کا انتخاب کیا جہاں نشیب میں بارش کے پانی کا ایک قدرتی نالہ گزرتا ہے۔ اس بات کا اندازہ لگایا گیا کہ اس نالے سے سالانہ کتنا پانی میسر ہوتا ہے۔ اس کے بعد بارش کے اس پانی کا رستہ روک کر ایک ڈیم کی شکل کا ذخیرہ بنایا گیا۔ جب کاغذ پر انھوں نے اس فارم کو ڈیزائن کیا تو اس کی سب سے بلند سطح پر انھوں نے ایک تالاب بنایا۔ سولر پاور کے ذریعے ڈیم میں سے پانی کو پمپ کر کے اس تالاب کو بھرا جاتا ہے۔ 'زمین کو ہم نے اس طرح ہموار کیا کہ ہم نے اس پر لگ بھگ سات بیڈ بنائے اور ان بیڈز کو مزید بلاکس میں تقسیم کیا۔ پھر ہر بلاک کی الگ پلاننگ ہوئی کہ اس میں کیا کاشت ہوگا۔' پانی کے تالاب سے ایک زیر زمین پائپ لائنوں کا نیٹ ورک جڑا ہے جو ہر بلاک تک پہنچتا ہے۔ یوں جس بلاک میں جتنا پانی درکار ہوتا ہے اتنا ہی پانی وہاں کھولا جاتا ہے اور زمین سیراب ہونے کے بعد ویلفٹی والو کی مدد سے بند کر دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد عظیم کہتے ہیں کہ انھوں نے فارم پر بلاکس کی منصوبہ بندی اس طرح کی ہے کہ جہاں فروٹ کے درخت چھوٹے چھوٹے باغوں کی مانند اگائے گئے ہیں، ان کے درمیان خالی جگہ پر سبزیاں اور سجاوٹ کے پھول اگائے گئے ہیں۔ 'یہ ایک مثال ہے۔ اس ہی طرح بنیادی طور پر اس فارم پر زمین کا انتہائی موافق استعمال کیا گیا ہے۔ زمین کے کسی ٹکڑے کو ضائع نہیں ہونے دیا گیا۔'

فارم پر کتنی پیداوار، کیسے لی جاتی ہے؟

ڈاکٹر محمد عظیم کہتے ہیں کہ فارم پر مختلف قسم کے 'کلچر' یا پراجیکٹ ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ روزانہ، ہفتہ وار، ماہانہ یا سالانہ بنیادوں پر آمدن دیتے ہیں۔ مختلف بلاکس کے اندر سٹرس اور مالٹے کی کئی اقسام کے پودے لگے ہیں جو بھرپور پھل دے رہے ہیں۔ سینکڑوں فروٹ کے درخت گزرگاہوں، چار دیواری اور فارم کے باہر سڑک اور چار دیواری کی درمیانی جگہ پر لگائے گئے ہیں۔ ان میں بدیسی نسل کے پھل جن میں ایوا کاڈو اور پیشن فروٹ کے پودے بھی شامل ہیں جو پھل دے رہے ہیں۔

پھلوں کے پودوں کو اس ترتیب سے لگایا گیا ہے کہ ان کے درمیان سبزیوں اور سجاوٹ والے پھولوں کی کاشت کے لیے وافر جگہ میسر ہے۔ یہاں ہر قسم کی سبزیاں لگائی گئی ہیں۔ 'ہمارے فارم پر ایک بہت بڑی کاروباری سرگرمی سجاوٹی پھولوں کی ہے۔ ہم سالانہ تقریباً ڈھائی لاکھ کے قریب مختلف اقسام کے پھولوں کی فصل اٹھاتے ہیں۔ یہ پھول بکنے کے لیے مقامی مارکیٹ میں جاتا ہے۔

اس فارم پر انھوں نے نسبتاً نشیب میں ایک ٹنل بنا رکھی ہے جس کا رخ سورج کی جانب ہے۔ اسے وہ چائنیز طرز کی ٹنل کہتے ہیں۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ انتہائی سردی میں بھی اس ٹنل میں گرمیوں کی سبزیاں اگانے کے لیے موزوں درجہ حرارت قائم رکھا جاسکتا ہے۔ یہاں سے آنے والی ان کی فصل مارکیٹ میں باقی سبزیوں سے پہلے آ جاتی ہے اور اچھے دام دیتی ہے۔ ایک دوسری ٹنل میں وہ زیادہ مہنگے بکنے والے بیش قیمت پھول اگاتے ہیں جہاں سورج کی روشنی اور درجہ حرارت کو ضرورت کے مطابق رکھا جاسکتا ہے۔

قدرتی یا ری جینریٹو فارمنگ کیسے کی جاتی ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے؟

زرعی سائنسدان ڈاکٹر محمد عظیم نے فارم پر اگنے والی سبزیوں کے پودوں اور سٹرس سے بھرے پودوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ 'ان کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ بغیر کسی کیمیکل کھاد کے اگ رہے ہیں۔ اسی کو ری جینریٹو کہتے ہیں۔' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس فارم پر تمام تر فصلیں قدرتی طریقے سے اگاتے ہیں۔ اس کے لیے فارم پر ہی ایک کونہ مخصوص کیا گیا ہے جہاں وہ جانوروں کے فضلے، جڑی بوٹیوں کے باقیات اور مٹی کی مدد سے قدرتی کھاد تیار کرتے ہیں۔ یہ کھاد پورے فارم پر پھیلائی جاتی ہے۔ اس طرح فارم قدرتی طور پر مسلسل زرخیز رہتا ہے۔ 'ہمارے پھلوں کے درختوں نے دوسرے سال ہی پھل دینا شروع کر دیا تھا۔ بعض درخت تو ہماری توقع سے زیادہ جلدی بڑے ہوئے اور آندھی سے گر بھی گئے۔' ڈاکٹر محمد عظیم کے مطابق وہ فارم پر اگنے والی جڑی بوٹیوں کو تلف کرنے کے لیے بھی ادویات کا استعمال نہیں کرتے بلکہ انھیں ہاتھ سے نکالا جاتا ہے۔

فارم پر بننے والی قدرتی کھاد کو وہ پنیریاں لگانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یوں ان کو بازار سے مہنگے داموں ملنے والے کوکو پیٹ وغیرہ خریدنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ فارم پر ہی ہزاروں پودوں کی نرسری ٹرے کلچر کے اندر تیار ہے۔ یہیں سے ان کو زمین پر منتقل کیا جاتا ہے۔

اس فارم سے منافع کیسے آتا ہے؟

فارم کے مالک میاں عبدالرؤف نے کے مطابق اب وہ اس سطح پر پہنچ گئے ہیں جہاں فارم اپنا خرچ خود اٹھا رہا ہے۔ 'بلکہ میں کہوں گا کہ اس سے بھی آگے چلا گیا ہے۔' ان کا کہنا ہے کہ اس فارم کو بنانے پر ان کا خرچ اس لیے زیادہ ہوا کیونکہ انھیں مشینوں کے استعمال سے اس جگہ کو ہموار کرنا پڑا۔ اس کے بعد پانی کا بندوبست کرنے کے لیے بھی انھیں یہاں تعمیرات کرنے ساتھ ساتھ سولر سسٹم نصب کرنا تھا۔

آبپاشی کا پائپ لائن کا نظام بنانے کے لیے بھی انھیں فارم پر خرچ کرنا پڑا۔ 'یہ جگہ کم ضرور ہے لیکن جتنی بڑی تعداد میں یہاں درخت لگے ہیں تو اس پر ایک خرچ آیا۔ لیکن یہ ایک وقت کا خرچ تھا۔ اب یہاں پانی سمجھ لیں مفت ہے اور درخت جوان ہو چکے ہیں۔' وہ سمجھتے ہیں کہ بہت جلد وہ فارم سے آنے والی آمدن سے اس پر ہونے والا کل خرچ نکال لیں گے اور اس کے بعد اس سے جو آمدن آئے گی وہ تمام تر ان کے لی منافع ہوگی کیونکہ فارم 'سیلف سسٹین ایبل ہے یعنی اپنا خرچ خود اٹھا سکتا ہے۔'

زرعی سائنسدان ڈاکٹر محمد عظیم کہتے ہیں کجب آپ درخت لگاتے ہیں تو آپ کو اس کی کل مالیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'اس فارم سے ہمیں ساٹھ سے ستر لاکھ روپے سالانہ پھلوں سے آئیں گے۔ اس کے علاوہ سبزیوں سے ہمیں روزانہ، ہفتہ وار یا ماہانہ آمدن ہوتی ہے۔ سجاوٹ والے پھولوں سے ہمیں ایک الگ بڑی آمدن آ رہی ہے۔' فارم سے پیدا ہونے والے مرغیوں اور بطخوں کے انڈے اور مچھلی وغیرہ سے بھی ان کے پاس آمدن کا ایک ذریعہ موجود ہے۔

(باقی صفحہ 15 پر)











کیا حجاب یا ہیلمٹ پہننے سے بال جھڑنے لگتے ہیں؟

کیا ہیلمٹ پہننے سے واقعی بال جھڑتے ہیں؟ کیا حجاب سر تک ہوا نہ پہنچنے کی وجہ سے بالوں کی جڑیں کمزور کر دیتا ہے؟ اور کیا شیمپو بدلنے یا روزانہ تیل لگانے سے بالوں کا جھڑنا روکا جا سکتا ہے؟

بالوں سے متعلق ایسی کئی باتیں عام ہیں، لیکن ان میں حقیقت کتنی ہے اور کون سے تصورات محض غلط فہمیاں ہیں؟

کیا ہیلمٹ پہننے سے واقعی بال جھڑتے ہیں؟ کیا حجاب سر تک ہوا نہ پہنچنے کی وجہ سے بالوں کی جڑیں کمزور کر دیتا ہے؟ اور کیا شیمپو بدلنے یا روزانہ تیل لگانے سے بالوں کا جھڑنا روکا جا سکتا ہے؟

بالوں سے متعلق ایسی کئی باتیں عام ہیں، لیکن ان میں حقیقت کتنی ہے اور کون سے تصورات محض غلط فہمیاں ہیں؟

بال جھڑنے کی وجوہات، ان کے علاج اور اس مسئلے سے بچنے کے طریقوں کے بارے میں لوگوں کے درمیان مختلف تصورات پائے جاتے ہیں۔ تاہم یہ سوال بھی موجود ہے کہ بالوں سے متعلق عام طور پر پائی جانے والی ان باتوں میں کتنی حقیقت ہے۔

آیئے جانتے ہیں ماہرین اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

برطانیہ کی نیشنل ہیلتھ سروس (این ایچ ایس) کے مطابق روزانہ 50 سے 100 بال جھڑنا معمول کی بات ہے۔ تاہم اگر آپ محسوس کریں کہ معمول سے زیادہ بال جھڑ رہے ہیں تو جلد از جلد کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔ طبی اصطلاح میں معمول سے زیادہ بال جھڑنے اور ان کی جگہ اتنی ہی رفتار سے نئے بال نہ اُگنے کی کیفیت کو 'ایلوپیشیا' کہا جاتا ہے۔ این ایچ ایس کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر میں 14 کروڑ سے زیادہ افراد ایلوپیشیا یعنی مکمل یا جزوی گنج پن کا شکار ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ بالوں کا جھڑنا انسانی جسم کا ایک قدرتی عمل ہے۔ تاہم بعض اوقات اس کی وجہ کوئی بیماری، ہارمونز میں تبدیلی، غذائی اجزا کی کمی یا ذہنی دباؤ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ بالوں کا کتنا جھڑنا معمول کی بات ہے، کب یہ مسئلہ غیر معمولی ہو جاتا ہے اور بالوں سے متعلق عام تصورات میں سے کون سے درست نہیں ہیں۔

بال کیوں جھڑتے ہیں؟

بال جھڑنے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں اور یہ ہر شخص میں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض افراد کے بال موروثی وجوہات کی بنا پر جھڑتے ہیں، کچھ میں اس کی وجہ صفائی کا خیال نہ رکھنا جبکہ بعض لوگوں میں عمر بڑھنے کے ساتھ بال جھڑنے لگتے ہیں۔

اس کے علاوہ مردوں اور خواتین میں بال جھڑنے کی وجوہات اور انداز بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔ مردوں میں گنج پن کی سب سے عام قسم کو طبی زبان میں 'اینڈروجینیٹک ایلوپیشیا' یا عام گنج پن کہا جاتا ہے۔ اس میں پیشانی کے دونوں جانب بال کم ہونے لگتے ہیں اور سر کے درمیان والے حصے میں بھی گنج پن نمایاں ہو جاتا ہے۔ خواتین میں عموماً سر کے درمیان مانگ چوڑی ہونے لگتی ہے اور بال پتلے ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ موروثی عوامل یا ہارمونز کے لیے جسم کی حساسیت ہو سکتی ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ یہ مسئلہ زیادہ نمایاں ہو سکتا ہے۔

خواتین میں پولی سسٹک اووری سنڈروم (پی سی او ایس)، حمل اور بچے کی پیدائش کے دوران ہارمونز میں تبدیلی بھی بال جھڑنے کا سبب بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ تھائیرائڈ ہارمونز کی مقدار کم یا زیادہ ہونے سے بھی بال جھڑ سکتے ہیں۔ جلد کے امراض کی ماہر اور کاسمیٹک سرجن ڈاکٹر شائلہ حق کے مطابق جینیاتی وجوہات یا ہارمونز میں مختلف اقسام کے عدم توازن کی وجہ سے بھی بال جھڑ سکتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ 'جسم میں غذائی اجزا کی کمی، خصوصاً آئرن، وٹامن ڈی اور زنک کی کمی کے شکار افراد کے بال جھڑ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ شدید ذہنی دباؤ اور پریشانی بھی بال جھڑنے کا سبب بن سکتی ہے۔'

ڈاکٹر شائلہ حق کے مطابق مردوں اور خواتین میں بال جھڑنے کا انداز ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ان کا کہنا ہے کہ 'خواتین میں زیادہ تر بال جھڑنے کی وجہ ہارمونز کا عدم توازن اور وٹامن ڈی کی کمی ہوتی ہے۔'

بال بنیادی طور پر ایک پروٹین 'کیراٹین' سے بنتے ہیں۔ جسم میں پروٹین، آئرن، زنک، وٹامن ڈی، وٹامن بی 12 اور بایوٹن کی کمی سے بال کمزور ہو سکتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں بہت سی خواتین آئرن کی کمی سے ہونے والی خون کی کمی کا شکار ہیں، جو بال جھڑنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ اسی طرح غذا میں کمی کر کے اچانک وزن گھٹانا، طویل وقت تک بھوکا رہنا اور کھانے پینے کی بے قاعدگیوں سے بھی بال زیادہ جھڑ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض افراد کو ذہنی دباؤ، تیز بخار، ڈینگی، ٹائیفائڈ اور کووڈ جیسی بیماریوں، آپریشن یا بچے کی پیدائش کے دو سے تین ماہ بعد اچانک بال جھڑنے لگتے ہیں۔

سر میں خشکی، سیبوریائک ڈرماٹائٹس اور فنگس کے انفیکشن سے سر کی جلد متاثر ہو سکتی ہے، جس کے نتیجے میں بال زیادہ جھڑنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ایلوپیشیا ایریاٹا نامی خود کار مدافعتی بیماری بھی بال جھڑنے کا سبب بنتی ہے۔ کچھ ادویات، مثلاً کینسر کے علاج میں استعمال ہونے والی کیموتھراپی، بلڈ پریشر، ڈپریشن اور جوڑوں کے درد کی دوائیں بھی بال جھڑنے میں اضافے کا سبب بن سکتی ہیں۔ ڈاکٹر شائلہ حق کے مطابق بعض اوقات بالوں کو سٹائل کرنے کے لیے مختلف طریقوں، مثلاً کیمیائی ٹریٹمنٹ اور ہیئر ری بانڈنگ کا ضرورت سے زیادہ استعمال بھی بال جھڑنے کا باعث بن سکتا ہے۔

کیا حجاب یا ہیلمٹ پہننے سے بال جھڑتے ہیں؟

پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش جیسے گرم اور مرطوب موسم میں طویل وقت تک ہیلمٹ پہننے سے سر پر پسینہ جمع ہو سکتا ہے۔ پسینے، گرد و غبار اور چکنائی کے ملنے سے سر کی جلد پر فنگس کا انفیکشن، خشکی یا بالوں کی جڑوں میں سوزش ہو سکتی ہے۔ اگر سر کی جلد پر طویل عرصے تک انفیکشن رہے تو بال زیادہ جھڑ سکتے ہیں۔ تاہم ماہرین کا کہنا ہے کہ 'اس کی وجہ حجاب یا ہیلمٹ پہننا نہیں ہے۔'

ماہرِ امراضِ جلد ڈاکٹر توحیدہ رحمان ایرن کے مطابق سر کے بالوں کو طویل وقت تک ڈھانپ کر رکھنے سے وہاں نمی اور پسینہ جمع ہو سکتا ہے، جس سے سر کی جلد میں موجود بالوں کی جڑیں متاثر ہوتی ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ 'گرم اور مرطوب موسم میں طویل وقت تک ہیلمٹ، ٹوپی یا حجاب پہننے سے بالوں کی جڑوں میں فنگس یا بیکٹیریا کا انفیکشن ہو سکتا ہے۔' اگر حجاب، ٹوپی یا ہیلمٹ کی پٹی اتنی سخت باندھی جائے کہ روزانہ ایک ہی جگہ بالوں پر کھنچاؤ پڑے تو اس سے ایک خاص قسم کے گنج پن کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ طبی اصطلاح میں اسے 'ٹریکشن ایلوپیشیا' کہا جاتا ہے۔ تاہم عام طور پر ٹوپی پہننے سے ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس کی وجہ بالوں کو بہت سختی سے باندھنا یا بار بار ایک ہی انداز میں کھینچ کر باندھنا ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر شائلہ حق نے بتایا کہ 'اگر ہیلمٹ بہت تنگ ہو تو اس سے بالوں کی جڑوں پر دباؤ پڑ سکتا ہے اور بال جھڑنے لگتے ہیں۔ ہیلمٹ سے بال ٹوٹ بھی سکتے ہیں، جبکہ ضرورت سے زیادہ پسینہ آنے سے سر کی جلد پر جلن یا انفیکشن ہو سکتا ہے۔' اس کے علاوہ نہانے کے بعد گیلے بالوں کے ساتھ ہیلمٹ پہننے سے بال ٹوٹنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، کیونکہ گیلے بال خشک بالوں کے مقابلے میں زیادہ نرم اور نازک ہوتے ہیں۔

ڈاکٹرز مشورہ دیتے ہیں کہ ہیلمٹ کے اندر موجود پیڈ کو باقاعدگی سے صاف کیا جائے۔ پسینے سے بھیگا ہوا ہیلمٹ طویل وقت تک نہیں پہننا چاہیے اور بال مکمل طور پر خشک ہونے کے بعد ہی ہیلمٹ پہننا چاہیے۔ اگر سر میں خشکی یا خارش ہو تو ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر ایرن کے مطابق حجاب پہننے والوں کو بھی اسی طرح احتیاط کرنی چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت سے لوگ حجاب سختی سے باندھتے ہیں اور اس کے اوپر کپڑے کی مزید تہیں بھی پہن لیتے ہیں۔ ان کے مطابق حجاب کو قدرے ڈھیلا باندھنا چاہیے تاکہ ہوا کی آمد و رفت برقرار رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف حجاب، ٹوپی یا ہیلمٹ پہننے سے بال نہیں جھڑتے۔ کسی بھی شخص کے بال جسمانی، ذہنی یا بیرونی عوامل کی وجہ سے جھڑ سکتے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹرز بالوں اور سر کی جلد کی مناسب دیکھ بھال کا مشورہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شائلہ حق نے بتایا کہ 'باہر کا موسم، گرد و غبار اور مختلف اقسام کی آلودگی بھی بال جھڑنے کا سبب بن سکتی ہیں۔' ان کے مطابق بالوں اور سر کی جلد کا خیال رکھنا چاہیے اور کسی بھی مسئلے کی صورت میں ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔

بال جھڑنے سے بچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

ماہر ڈاکٹروں کے مطابق بال جھڑنے کا مسئلہ کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی وجہ معلوم کی جائے، بروقت علاج شروع کیا جائے اور بالوں کی مناسب دیکھ بھال کی جائے۔

ڈاکٹر شائلہ حق کا مشورہ ہے کہ جن لوگوں میں موروثی طور پر ایلوپیشیا کا مسئلہ ہو، انھیں جلد علاج شروع کر دینا چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ 'اگر بال جھڑنے کی وجہ موروثی ہو تو اس کے لیے خوب صورتی سے متعلق طبی علاج کیا جا سکتا ہے، جبکہ ہارمونز یا غذائی اجزا کی کمی کی صورت میں سپلیمنٹس دیے جا سکتے ہیں۔' بالوں کو صحت مند رکھنے کے لیے ڈاکٹرز روزمرہ خوراک میں پروٹین، آئرن اور وٹامن سی سے بھرپور غذائیں شامل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان میں انڈے، مچھلی، گوشت، دالیں، چنے، پالک، سرخ رنگ کی سبزیاں، خشک میوہ جات، کیلے، امرود اور لیموں شامل ہیں۔

ماہرِ امراضِ جلد ڈاکٹر توحیدہ رحمان کے مطابق آملہ اور امرود سمیت موسم میں دستیاب کھٹے پھل بالوں کے لیے فائدہ مند ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 'پروٹین سے بھرپور غذائیں بھی کھانی چاہییں کیونکہ بال بنیادی طور پر پروٹین سے بنتے ہیں۔ مچھلی میں موجود زنک بھی بالوں کی بہتر نشوونما میں مدد دیتا ہے۔'

ڈاکٹرز بالوں کی باقاعدگی سے دیکھ بھال پر بھی زور دیتے ہیں۔ روزانہ شیمپو کرنا ضروری نہیں، تاہم جو لوگ روزانہ گرد و غبار اور پسینے کی زد میں رہتے ہیں وہ ڈاکٹر کے مشورے سے روزانہ شیمپو استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹرز مشورہ دیتے ہیں کہ شیمپو کے بعد کنڈیشنر بالوں کی جڑوں کے بجائے صرف سروں پر لگائیں، گیلے بالوں کو کنگھی سے زور سے نہ کھینچیں اور بال خشک کرنے کے لیے بہت زیادہ گرم ہیئر ڈرائر استعمال نہ کریں۔ ڈاکٹر ایرن کا مشورہ ہے کہ شیمپو کے انتخاب میں ایسے شیمپو کو ترجیح دی جائے جن میں ایلوویرا اور آملہ جیسے پودوں سے حاصل کیے گئے اجزا شامل ہوں۔

(باقی صفحہ 15 پر)









وزیراعلیٰ پنجاب مریم نواز شریف کے ویژن کے مطابق
ہر مریض کو عالمی معیار کی، جدید اور مفت طبی سہولیات میسر کریں گے

جنرل ہسپتال لاہور کے نئے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر جعفر شاہ (نیورولوجی سپیشلسٹ) نے چارج سنبھال لیا،

ہسپتال کو ماڈل آف دی آرٹ بنانے کا عزم، کرپشن کسی طور پر برداشت نہیں کی جائے گی۔ سب کو اپنا قبلہ درست کر لینا چاہیے

مقصود خالد
بیورو چیف لاہور

ڈاکٹر جعفر شاہ ایک ایسی شخصیت ہیں جن کی علمی قابلیت، انتظامی مہارت، اخلاقی کردار اور پیشہ ورانہ دیانت داری نے انہیں پنجاب کے سرکاری صحت کے نظام میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ ان کی پوری پیشہ ورانہ زندگی مریضوں کی خدمت، ہسپتال کے نظام کو بہتر بنانے اور سرکاری صحت کی سہولتوں کو عوام کے قریب لانے کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ جب انہیں وزیر اعلیٰ پنجاب مریم نواز شریف کے ویژن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جنرل ہسپتال لاہور کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا تو یہ تقرری محض ایک انتظامی تبدیلی نہیں بلکہ ایک طویل تجربے، ثابت شدہ قابلیت اور مخلصانہ خدمات کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر جعفر شاہ نے اپنی کیریئر کے آغاز سے ہی یہ واضح کر دیا تھا کہ طب کی خدمت صرف دوا اور تشخیص تک محدود نہیں بلکہ مریض کے احترام، اس کے لواحقین کے ساتھ حسن سلوک اور نظام کی شفافیت بھی اس کا لازمی حصہ ہے۔ ان کی انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ جناح ہسپتال میں اے ایم ایس ایڈمن کے طور پر بھی خدمات انجام دے چکے ہیں جہاں انہوں نے انتظامی امور کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تیرہ سال سے زائد عرصے تک جنرل ہسپتال میں مختلف عہدوں پر خدمات انجام دینے کی وجہ سے وہ اس ادارے کے ہر شعبے، ہر مسئلے اور ہر چیلنج سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ واقفیت انہیں محض ایک نئے سربراہ نہیں بلکہ ایک ایسے رہنما کے طور پر پیش کرتی ہے جو اندر سے نظام کو سمجھتا ہے اور باہر سے اصلاحات لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی نفاست اور وقار پایا جاتا ہے جو انہیں عام افسران سے ممتاز کرتی ہے۔

وہ نہایت قابل، نرم مزاج لیکن اصول پسند، اور انتظامی امور پر مکمل عبور رکھنے والے بہترین آفیسر ہیں۔ ان کی یہ خصوصیات ہی وجہ ہیں کہ انہیں اس اہم ذمہ داری کے لیے منتخب کیا گیا۔ جب وہ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کا چارج سنبھالتے ہیں تو ان کا پہلا کام ہسپتال کے تمام شعبوں کا تفصیلی دورہ کرنا ہوتا ہے۔ ایمرجنسی، او پی ڈی، وارڈز، آپریشن تھیٹرز، لیبارٹری اور فارمیسی کا جائزہ لے کر وہ مریضوں سے براہ راست بات کرتے ہیں اور ان کے مسائل سنتے ہیں۔ یہ طریقہ کار ان کی مریض دوست شخصیت کا مظہر ہے۔ وہ صرف فائلز اور رپورٹس پر انحصار نہیں کرتے بلکہ خود میدان میں اتر کر صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی قیادت میں جنرل ہسپتال کو ماڈل آف دی آرٹ ہسپتال بنانے کا عزم محض الفاظ نہیں بلکہ ایک عملی منصوبہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ پنجاب کا سب سے بڑا ہسپتال ہونے کی حیثیت سے یہاں روزانہ ہزاروں مریض آتے ہیں اور ان مریضوں کو بہترین سہولت فراہم کرنا ہی اصل خدمت ہے۔

ڈاکٹر جعفر شاہ کی کارکردگی کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ہمیشہ مریض کے حقوق کو مقدم رکھتے ہیں۔ صفائی ستھرائی، نظم وضبط، ایمرجنسی کے نظام اور ادویات کی بروقت فراہمی جیسے بنیادی معاملات ان کی اولین ترجیح ہیں۔ وہ عملے کو سخت ہدایات جاری کرتے ہیں کہ ڈیوٹی کے دوران کوئی غفلت برداشت نہیں کی جائے گی۔ ڈاکٹرز اور نرسز کی بروقت حاضری کو یقینی بنانا، مریضوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اور کسی بھی قسم کی بدتمیزی کو برداشت نہ کرنا ان کی انتظامی پالیسی کا حصہ ہے۔ ان کی قابلیت صرف طبی علم تک محدود نہیں بلکہ انتظامی معاملات میں بھی وہ گہری بصیرت رکھتے ہیں۔ پروموشن، انتظامی مسائل، عملے کی سہولتیں اور کرپشن کے خاتمے جیسے معاملات پر ان کی واضح پالیسی ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ جب عملہ مطمئن ہوگا تو مریضوں کو بہتر علاج ملے گا۔ اس لیے وہ فیکلٹی اور میڈیکل سٹاف کے لیے تمام ممکنہ سہولتیں فراہم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان کی یہ سوچ ہی انہیں ایک کامیاب انتظامیہ بناتی ہے۔ ڈاکٹر جعفر شاہ کی دیانت داری اور فرض شناسی کا اعتراف نہ صرف عملے بلکہ مریضوں نے بھی کیا ہے۔ مریض اکثر کہتے ہیں کہ وہ وارڈز میں خود آ کر خیریت پوچھتے ہیں اور مسائل کا موقع پر حل نکالتے ہیں۔ یہ عادت ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ وہ اپنے دفتر کے دروازے ہر مریض اور لواحقین کے لیے کھلے رکھتے ہیں تاکہ کوئی بھی شکایت بلا جھجک پہنچ سکے۔ یہ کھلا پن اور شفافیت ہی ان کی قابلیت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اصولوں پر مبنی فیصلے کیے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سرکاری ہسپتال میں کام کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ یہاں آنے والے زیادہ تر غریب اور متوسط طبقے کے لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس پرائیویٹ علاج کے وسائل نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کا ویژن یہ ہے کہ سرکاری ہسپتال میں علاج پرائیویٹ ہسپتالوں سے بہتر اور مفت ہونا چاہیے۔ یہ ویژن وزیر اعلیٰ پنجاب کے ویژن سے ہم آہنگ ہے اور ڈاکٹر جعفر شاہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری طرح پرعزم ہیں۔



ڈاکٹر جعفر شاہ کی انتظامی مہارت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ ٹیم ورک پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ ڈاکٹرز، نرسز اور پیرا میڈیکل سٹاف کی مشترکہ کوششوں سے ہی جنرل ہسپتال کو مثالی بنایا جا سکتا ہے۔ وہ خود اس ٹیم کا حصہ بن کر کام کرتے ہیں نہ کہ صرف حکم جاری کرنے والے سربراہ۔ یہ انداز قیادت انہیں عملے کے قریب لاتا ہے اور اعتماد پیدا کرتا ہے۔ ان کی علمی قابلیت بھی قابل ذکر ہے۔ طب کے میدان میں مسلسل مطالعہ، نئی ٹیکنالوجی سے واقفیت اور جدید انتظامی طریقوں کا علم انہیں ایک مکمل پیشہ ور بناتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آج کے دور میں ہسپتال کو چلانے کے لیے صرف طبی علم کافی نہیں بلکہ انتظامی مہارت، مالیاتی نظم، انسانی وسائل کا بہتر استعمال اور مریضوں کی اطمینان سب کچھ درکار ہے۔

ڈاکٹر جعفر شاہ نے واضح طور پر کہا ہے کہ جنرل ہسپتال کی فیکلٹی کے لیے تمام ضروری سہولیات فراہم کی جائیں گی اور بہتر انتظامی اقدامات کیے جائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ جب ڈاکٹر سکون اور اطمینان کے ساتھ کام کریں گے تو مریضوں کا علاج بھی بہتر ہوگا۔ فیکلٹی کسی بھی ہسپتال کی اصل طاقت ہوتی ہے۔ اگر ڈاکٹروں کو مناسب ماحول، وسائل، احترام اور انتظامی تعاون میسر ہو تو وہ اپنی مکمل صلاحیتوں کے ساتھ مریضوں کی خدمت کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جعفر شاہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سرکاری ہسپتالوں میں اکثر ڈاکٹروں کو وسائل کی کمی، انتظامی مسائل، پروموشن کے معاملات اور کام کے زیادہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل کو حل کرنا ان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ وہ فیکلٹی کے لیے بہتر کام کے ماحول، ضروری آلات اور ساز وسامان، بروقت سپورٹ سٹاف اور انتظامی معاملات میں شفافیت فراہم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ڈاکٹر جب اپنے ذاتی اور پیشہ ورانہ مسائل سے آزاد ہو کر کام کرے گا تو اس کی توجہ مکمل طور پر مریض پر مرکوز ہوگی۔ اس لیے وہ فیکلٹی کے مسائل سننے، ان کا حل نکالنے اور انہیں بہتر سہولتیں فراہم کرنے کے لیے عملی اقدامات کریں گے۔ وہ مانتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی اطمینان ہی ہسپتال کی کارکردگی کی ضمانت ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ فیکلٹی کے ساتھ باقاعدہ مشاورت، ان کے مشوروں کو اہمیت دینا اور ان کی جائز ضروریات پوری کرنے کی پالیسی اپنائیں گے۔ اس طرح ڈاکٹر سکون کے ساتھ مریضوں کا علاج کر سکیں گے اور ہسپتال کا مجموعی معیار بلند ہوگا۔







ڈاکٹر جعفر شاہ کی شخصیت میں نفاست اور تہذیب کا عنصر انہیں ایک مثالی آفیسر بناتا ہے۔ وہ سخت فیصلے بھی نرم لہجے میں کرتے ہیں اور اصولوں پر مضبوطی سے کھڑے رہتے ہیں۔ کرپشن کے معاملے میں ان کا موقف بالکل واضح ہے کہ ہسپتال میں کسی قسم کی کرپشن برداشت نہیں کی جائے گی اور سب کو اپنا قبلہ درست کرنا ہوگا۔ یہ سختی ان کی دیانت داری کی علامت ہے۔ مریضوں کے ساتھ بدتمیزی پر بھی ان کا موقف سخت ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ مریض اور اس کے لواحقین ہسپتال کے مہمان ہیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک ہر ملازم کی ذمہ داری ہے۔ ان کی یہ تمام خصوصیات مل کر انہیں ایک ایسا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بناتی ہیں جو نہ صرف نظام کو چلا سکتا ہے بلکہ اسے بہتر بھی بنا سکتا ہے۔ ان کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ہمیشہ نتائج پر توجہ دیتے ہیں۔ وہ صرف وعدے نہیں کرتے بلکہ عملی اقدامات کرتے ہیں۔ مشینری کو فعال کرنا، ٹیسٹ فری اور ادویات فری فراہم کرنا، ایمرجنسی کو بہتر بنانا اور عملے کی سہولتیں بڑھانا جیسے اقدامات ان کی عملی سوچ کا ثبوت ہیں۔ ان کی قیادت میں جنرل ہسپتال نہ صرف مریضوں کے لیے بہتر ہوگا بلکہ دیگر سرکاری ہسپتالوں کے لیے بھی ایک مثال بن سکتا ہے۔

ڈاکٹر جعفر شاہ ایک ماہر دماغی امراض (نیورولوجی) کے سپیشلسٹ ہیں جنہوں نے اپنے شعبے میں نہایت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دماغی امراض کا شعبہ طب کا ایک حساس اور پیچیدہ میدان ہے جہاں درست تشخیص، بروقت علاج اور مریض کے ساتھ مکمل توجہ بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر جعفر شاہ نے اس شعبے میں طویل تجربے اور گہری مہارت کے ذریعے ہزاروں مریضوں کو صحت یاب ہونے میں مدد فراہم کی ہے۔ انہوں نے فالج، مرگی، پارکنسنز، مائیگرین، اعصابی کمزوری اور دیگر پیچیدہ دماغی بیماریوں کے علاج میں اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔ ان کی تشخیص کی درستگی، جدید طبی طریقوں سے واقفیت اور مریض پر مکمل توجہ دینے کا انداز انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز بناتا ہے۔ وہ صرف ادویات تجویز کرنے تک محدود نہیں رہتے بلکہ مریض اور اس کے خاندان کو بیماری کی تفصیلات، احتیاطی تدابیر اور طویل مدتی دیکھ بھال کے بارے میں مکمل رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان کی یہ پیشہ ورانہ صلاحیت اور مریض دوستی ہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف ایک کامیاب نیورولوجسٹ کے طور پر جانے جاتے ہیں بلکہ اب جنرل ہسپتال لاہور جیسے بڑے ادارے کی انتظامیہ سنبھالنے کے اہل بھی سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے شعبے میں بہترین کارکردگی نے انہیں انتظامی ذمہ داریوں کے لیے بھی اعتماد دلوایا ہے اور وہ اس تجربے کو ہسپتال کے مجموعی نظام کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر جعفر شاہ نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وہ وزیر اعلیٰ پنجاب، وزیر صحت اور سیکرٹری صحت کے اعتماد پر پورا اتریں گے۔ ان کا یہ بیان محض رسمی الفاظ نہیں بلکہ ایک گہری ذمہ داری کا اظہار ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان پر جو اعتماد کیا گیا ہے وہ بہت بڑا ہے اور اس اعتماد کو قائم رکھنے کے لیے انہیں مریضوں کو علاج کی بہتر سہولیات میسر کرانے کے لیے عملی اور بہترین اقدامات کرنے ہوں گے۔ ان کا عزم یہ ہے کہ ہر مریض کو بروقت، معیاری اور شفاف علاج فراہم کیا جائے تاکہ سرکاری صحت کے نظام پر عوام کا اعتماد مزید مستحکم ہو سکے۔

ڈاکٹر جعفر شاہ نے انتظامی لحاظ سے واضح موقف اپنایا ہے کہ ہسپتال کے تمام میڈیکل سٹاف کے مسائل حل کیے جائیں گے۔ پروموشن اور دیگر انتظامی معاملات کو بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ وہ جانتے ہیں کہ عملے کے غیر حل شدہ مسائل کارکردگی پر منفی اثر ڈالتے ہیں۔ اس لیے وہ پروموشن کے معاملات میں شفافیت، بروقت کارروائی اور اصولوں پر مبنی فیصلوں کو یقینی بنائیں گے۔ انتظامی امور کو بہتر بنانے کے لیے وہ جدید طریقے اپنائیں گے تاکہ غیر ضروری تاخیر اور پیچیدگیاں ختم ہوں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ عملہ مطمئن ہو اور اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کرے۔

ڈاکٹر جعفر شاہ نے سختی سے کہا ہے کہ کسی قسم کی مریضوں یا ان کے لواحقین سے بدتمیزی برداشت نہیں کی جائے گی۔ تمام طبی سہولیات بہتر انداز میں فراہم کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ وہ مانتے ہیں کہ مریض اور اس کے لواحقین ہسپتال کے مہمان ہیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک ہر ملازم کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ کسی بھی بدتمیزی کی صورت میں فوری کارروائی کی جائے گی تاکہ مریضوں کا اعتماد قائم رہے۔ ڈاکٹر جعفر شاہ نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ ہسپتال میں کرپشن کسی طور پر برداشت نہیں کی جائے گی۔ سب کو اپنا قبلہ درست کر لینا چاہیے۔ وہ کرپشن کو نظام کی سب سے بڑی بیماری سمجھتے ہیں جو مریضوں کے حقوق کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس لیے شفافیت، احتساب اور سخت نگرانی کے ذریعے کرپشن کے خاتمے کو یقینی بنایا جائے گا۔

طبی حلقوں میں بھی ان کی قابلیت اور مخلصانہ خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ لوگ مانتے ہیں کہ ایسے تجربہ کار اور مخلص افسران ہی سرکاری صحت کے نظام کا وقار بلند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جعفر شاہ کی شخصیت، ان کی قابلیت اور ان کی کارکردگی کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ وہ ایک ایسے افسر ہیں جو عہدے کو ذمہ داری سمجھتے ہیں نہ کہ اقتدار۔ یہی سوچ انہیں کامیاب بناتی ہے اور یہی سوچ جنرل ہسپتال کو ماڈل آف دی آرٹ بنانے کی ضمانت ہے۔

(بقیہ: نئے صوبے ریفرنڈم، بلاول بھٹو کا سخت بیان)

بلاول بھٹو کے سخت بیان کے پیچھے پیپلز پارٹی کی سیاسی حکمت عملی بھی ہے۔ سندھ میں پارٹی کی مضبوط گرفت ہے اور تقسیم سے اس گرفت کے کمزور ہونے کا خدشہ ہے۔ دوسری طرف کچھ تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ پارٹی کو آئینی ترامیم کے نتائج کا ادراک اب ہو رہا ہے۔ سیاسی مبصرین نے اس تقابل کو بلاول بھٹو بمقابلہ محسن نقوی قرار دیا اور کہا کہ پیپلز پارٹی پرانے موقف پر قائم ہے۔ کچھ نے مسلم لیگ ن سے کھل کر موقف لینے کا مطالبہ بھی کیا۔ یہ بحث اب صرف نئے صوبوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے وفاقی وحدت، جمہوری مشاورت اور آئینی بالادستی کے سوالات اٹھا دیے ہیں۔ اگر ریفرنڈم کرایا جائے تو سوال یہ ہوگا کہ یہ پورے ملک میں ہوگا یا متعلقہ صوبوں میں، سوال کیسے مرتب کیا جائے گا اور نتیجہ قانونی طور پر کس حد تک پابند ہوگا۔ اگر آئینی راستہ اختیار کیا جائے تو صوبائی اسمبلیوں کی رضامندی حاصل کرنا مشکل ہو سکتا ہے خاص طور پر سندھ میں۔ سیاسی اتفاق رائے کے بغیر کسی بھی اقدام سے عدم استحکام بڑھ سکتا ہے۔ پاکستان جیسے متنوع ملک میں انتظامی ڈھانچے کی اصلاح ضروری ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے شفافیت، مشاورت اور آئینی عمل ناگزیر ہے۔ زبردستی یا یکطرفہ اقدامات سے نہ صرف سیاسی بحران پیدا ہو سکتا ہے بلکہ معاشرتی تقسیم بھی گہری ہو سکتی ہے۔ بلاول بھٹو کا بیان اس خطرے کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ محسن نقوی کی تجویز عوامی رائے کو اہمیت دینے کی کوشش ہے۔ اصل حل دونوں کے درمیان توازن تلاش کرنے میں ہے۔ پارلیمنٹ، صوبائی اسمبلیاں، سیاسی جماعتیں اور سول سوسائٹی مل کر ایک جامع قومی مکالمہ شروع کریں تو شاید بہتر نتیجہ نکلے۔ ورنہ یہ بحث صرف سیاسی امتیاز کا ذریعہ بن کر رہ جائے گی اور ملک کے حقیقی مسائل پس پشت رہ جائیں گے۔ نئے صوبوں کی بحث پاکستان کی وفاقی جمہوریت کی پختگی کا امتحان ہے۔ اگر اسے دانشمندی سے نمٹا گیا تو یہ بہتر حکمرانی کی طرف قدم ثابت ہو سکتا ہے اور اگر جذبات یا طاقت کے کھیل میں تبدیل ہوا تو اس کے نتائج سنگین ہو سکتے ہیں۔ کراچی کی سڑکوں پر خون بہنے کی بات ایک انتباہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کی رائے اہم ہے لیکن آئین کی بالادستی اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے متوازی رکھ کر ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے۔

☆.....☆

(بقیہ: سپر ایل نینو)

یہی احتیاط دنیا کے دوسرے خطوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ ماضی کے بڑے ایل نینو واقعات، مثلاً 1982-83، 1997-98 اور 2015-16، نے دنیا کے مختلف حصوں میں نمایاں موسمیاتی اثرات پیدا کیے، لیکن ہر واقعہ اپنی مخصوص سمندری و فضائی کیفیت کے باعث دوسرے سے مختلف بھی رہا۔ موجودہ 2026-27 کی صورتحال کا تقابل ماضی کے واقعات سے کرنا مفید ہے، مگر اسے عین ان جیسا قرار دے دینا درست نہیں۔

عالمی موسمیاتی ادارے کے مطابق 2023-24 کا مضبوط ایل نینو عالمی درجہ حرارت پر عارضی اضافی اثر ڈالنے والے عوامل میں شامل تھا اور انسانی سرگرمیوں سے پیدا ہونے والی طویل مدتی حدت کے ساتھ مل کر غیر معمولی عالمی درجہ حرارت میں کردار ادا کرتا رہا۔ اس تاریخی تجربے کی روشنی میں 2026-27 کے واقعے کی نگرانی اس لیے بھی اہم ہے کہ اگر ایل نینو بہت مضبوط سطح تک پہنچتا ہے تو عالمی حرارتی ریکارڈ اور شدید گرمی کے واقعات کے تناظر میں اس کے اثرات کا الگ سے جائزہ لینا ہوگا۔ سائنس ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ ایک واقعے کو دوسرے واقعے کی مکمل نقل سمجھنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ ہر ایل نینو کی پیدائش، اس کی سمندری ساخت، فضائی گردش، شدت، دورانیہ اور اختتام کا طریقہ مختلف ہو سکتا ہے۔ زرعی معیشتوں کے لیے موسمی پیش گوئی اس لیے اہم ہوتی جا رہی ہے کہ کسان محض بارش کے آنے یا نہ آنے پر منحصر نہیں رہنا چاہتے بلکہ انہیں پہلے سے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ موسم کا عمومی رجحان کس سمت جا سکتا ہے۔ بیج بونے کا وقت، فصل کا انتخاب، آب پاشی کی منصوبہ بندی، پانی کے ذخائر کا انتظام اور شدید موسمی واقعات سے بچاؤ سبھی بہتر پیش گوئی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح حکومتوں کے لیے بھی موسمیاتی معلومات محض سائنسی رپورٹ نہیں بلکہ منصوبہ بندی کا بنیادی ذریعہ بن سکتی ہیں۔

پانی کے حوالے سے پاکستان کی حساسیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ملک کے بڑے دریائی نظام کا تعلق برفانی ذخائر، بارش اور موسمی بہاؤ سے ہے۔ اگر مختلف موسمی عوامل ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بارش یا درجہ حرارت کے نمونے تبدیل کر دیں تو پانی کی دستیابی کا وقت اور مقدار دونوں متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایل نینو جیسے عالمی مظہر کو پاکستان کے لیے کسی ایک قطعی پیش گوئی کے بجائے خطرات اور امکانات کے وسیع تر فریم میں دیکھنا زیادہ مناسب ہے۔ ایل نینو کے حوالے سے ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ واقعہ موسمیاتی تبدیلی کے بڑے عالمی تناظر سے الگ ہے؟ یہاں بھی جواب سادہ نہیں۔ ایل نینو ایک قدرتی سمندری و فضائی مظہر ہے، جب کہ عالمی درجہ حرارت میں طویل مدتی اضافہ ایک الگ موسمیاتی عمل ہے۔ تاہم دونوں ایک ہی سیاروی نظام میں وقوع پذیر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے اثرات کے مشاہدے کو پیچیدہ بنا سکتے ہیں۔

کراچی ہو یا لاہور، سندھ کا دریائی علاقہ ہو یا شمالی پہاڑی خطہ، موسمیاتی معلومات کو شہری اور معاشی منصوبہ بندی کا حصہ بنانا آنے والے برسوں میں مزید اہم ہو سکتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سائنسی معلومات کو عملی حکمتِ عملی میں تبدیل کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ عالمی موسمیاتی ادارہ بھی زور دیتا ہے کہ موسمیاتی پیش گوئی کا اصل مقصد محض مستقبل کے موسم کی خبر دینا نہیں بلکہ حکومتوں، انسانی امدادی اداروں، زراعت، صحت، پانی اور توانائی کے شعبوں کو پہلے سے تیاری کا موقع دینا ہے۔ اگر پیش گوئی میں کسی شدید موسمی خطرے کا امکان بڑھ رہا ہو تو اس اطلاع کو بروقت مقامی منصوبہ بندی تک پہنچانا ہی ابتدائی انتباہی نظام کی اصل کامیابی ہے۔ اس اعتبار سے 2026-27 کا ایل نینو ایک سائنسی امتحان کے ساتھ ساتھ انتظامی امتحان بھی ہے۔ کیا دنیا اپنے پاس موجود سائنسی معلومات کو بروقت فیصلوں میں تبدیل کر سکے گی؟ کیا پانی کے ذخائر، زرعی منصوبہ بندی، شہری نکاسی آب، صحت عامہ اور توانائی کے نظام ممکنہ موسمی تغیرات کے لیے پہلے سے تیار کیے جا سکیں گے؟ یہ سوال صرف ماہرینِ موسمیات کے نہیں بلکہ ریاستی اداروں، معیشت دانوں، زرعی ماہرین، شہری منصوبہ سازوں اور عام معاشرے کے بھی ہیں۔

پاکستان پر ممکنہ اثرات

پاکستان میں 2026 کے مون سون کے موسم میں بارشیں معمول سے تقریباً 19 فیصد کم ریکارڈ کی گئیں، جو تین دہائیوں میں سب سے بڑا کمی کا رجحان تھا۔ سندھ میں کمی 50 فیصد سے زیادہ، بلوچستان میں 33 فیصد کے قریب اور خیبر پختونخوا میں بھی نمایاں کمی دیکھی گئی۔ ریاستی بینک آف پاکستان نے اپنے سالانہ جائزے میں خبردار کیا ہے کہ ایل نینو کی وجہ سے مالی سال 2026-27 میں زراعت اور غذائی تحفظ کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ ان کے مطابق سندھ، جنوبی پنجاب اور بلوچستان کے کچھ حصے خشک سالی جیسے حالات کا زیادہ شکار ہو سکتے ہیں۔ تاریخی اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مضبوط ایل نینو کے ادوار میں مکئی، کپاس اور گندم کی اوسط پیداوار میں کمی دیکھی گئی ہے۔ کسانوں کے لیے اس کا مطلب کم پیداوار، کم آمدنی، مویشیوں کے لیے چارے کی کمی اور پانی کی کمی ہو سکتا ہے۔ اگر سردیوں میں برفباری کم ہوئی یا بارش کی بجائے بارش زیادہ ہوئی تو بہار اور گرمیوں میں پانی کی دستیابی متاثر ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ درجہ حرارت میں اضافہ فصلوں کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے، خاص طور پر گندم کی بھرنے کے مرحلے میں۔ کسانوں پر اثرات زیادہ سنگین ہو سکتے ہیں۔ چھوٹے کسان جو بارانی علاقوں میں کاشت کرتے ہیں یا آب پاشی کے محدود وسائل رکھتے ہیں، ان کے لیے خشک سالی برداشت کرنے والے بیج، بروقت معلومات اور مالی مدد بہت اہم ہیں۔ اگر فصلیں متاثر ہوئیں تو دیہی معیشت، روزگار اور غذائی قیمتوں پر دباؤ پڑ سکتا ہے۔ پہلے سے ہی کئی علاقوں میں غذائی عدم تحفظ موجود ہے اور ایل نینو اسے مزید بڑھا سکتا ہے۔

پاکستان حکومت نے موسمیاتی تیاری کے کئی اقدامات اٹھائے ہیں۔ پاکستان میٹرولوجیکل ڈیپارٹمنٹ کو موسمی پیش گوئی اور ابتدائی انتباہی نظام بہتر بنانے کے لیے بجٹ مختص کیا گیا ہے۔ پنجاب میں اے آئی پر مبنی موسمیاتی آبزرویٹری قائم کی جا رہی ہے جو حقیقی وقت میں موسم، پانی، مٹی اور فضائی معیار کی نگرانی کرے گی اور سیلاب و دیگر خطرات کی پیش گوئی میں مدد دے گی۔ نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی اور صوبائی ادارے مون سون اور دیگر موسمی خطرات کے لیے پیشگی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ ایشیائی ترقیاتی بینک سے آفات کے لیے مشروط مالی سہولت حاصل کی گئی ہے تاکہ ہنگامی صورت میں تیزی سے فنڈز دستیاب ہوں۔ وزارت موسمیاتی تبدیلی قومی موافقت منصوبے اور سبز پاکستان پروگرام کے تحت کام کر رہی ہے۔ ریاستی بینک نے زرعی منصوبہ بندی میں ایل نینو کی تیاری شامل کرنے، موسمی پیش گوئی بہتر بنانے، پانی کے انتظام، بیج اور آدانوں کی بروقت دستیابی اور کمزور کسانوں کے لیے ہدفی مدد کی سفارش کی ہے۔ تیاری کے لیے ضروری ہے کہ خشک سالی برداشت کرنے والے بیج فراہم کیے جائیں، پانی ذخیرہ کرنے کے انتظامات بہتر بنائے جائیں، کسانوں تک بروقت انتباہ پہنچایا جائے، اور زراعت کو موسمیاتی دھچکوں سے محفوظ بنانے کے ساتھ ساتھ اسے حل کا حصہ بھی بنایا جائے۔ سرمایہ کاری بڑھانے، ابتدائی انتباہی نظام مضبوط کرنے اور مقامی منصوبہ بندی کو سائنسی معلومات سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ یہ وقت فیصلہ کن ہے: اگر اب تیاری کر لی گئی تو اثرات کم ہو سکتے ہیں، ورنہ غذائی تحفظ، پانی اور معیشت پر دباؤ بڑھ سکتا ہے۔ سپر ایل نینو محض بحرالکاہل کا واقعہ نہیں بلکہ پاکستان کی زراعت، کسانوں اور قومی منصوبہ بندی کے لیے ایک واضح امتحان ہے۔

☆.....☆

(بقیہ: بیٹی کو جہیز میں سولر پینل)

اس سال کے اوائل میں یہ پالیسی تبدیل کر دی گئی۔

فیصل آباد چیمبر آف کامرس کے صدر عارف احسان ملک کہتے ہیں کہ ’ابتدا میں ان کی پالیسی بہت مددگار تھی۔ لیکن پھر پالیسی بدل گئی۔ اب انھوں نے کم نرخ پر خریدنا اور زیادہ نرخ پر واپس فروخت کرنا شروع کر دیا ہے۔‘ عارف احسان ملک کہتے ہیں کہ اس سے چھوٹے اور درمیانے درجے کے کاروباروں پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اویس لغاری اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ابتدائی ماڈل کی لاگت قابلِ برداشت نہیں تھی، سولر پیدا کرنے والے جو بجلی نظام میں فراہم کرتے تھے وہ اس بجلی سے کہیں سستی ہوتی تھی جو بعد میں وہ نظام سے حاصل کرتے تھے۔ ’وہ منافع گرڈ کے باقی صارفین کی قیمت پر حاصل ہو رہا تھا۔ اگر ہم نے یہ ضوابط تبدیل نہ کیے ہوتے تو دو برس بعد تک باقی صارفین پر سالانہ کم از کم 150 سے 200 ارب روپے کا اضافی بوجھ پڑتا۔‘

گہرے رنگ کی جیکٹ اور گول چشمہ پہنے ایک شخص کیمرے کی جانب رخ کیے کھڑا ہے۔ پس منظر میں دھندلا شہری منظر اور درخت دکھائی دیتے ہیں۔ تصویر نرم دن کی روشنی میں لی گئی ہے اور شہر کا منظر دھندلی افق میں مدغم ہوتا نظر آتا ہے۔

اگرچہ وفاقی وزیر توانائی اویس لغاری تسلیم کرتے ہیں کہ شمسی توانائی کی جانب عوام کا ابتدائی رجحان حکومت کے لیے غیر متوقع تھا، تاہم ان کا کہنا ہے کہ اب سولر کے پھیلاؤ کو آئندہ دس برس کی منصوبہ بندی میں شامل کر لیا گیا ہے اور قومی گرڈ چھوڑنے والے صارفین کی رفتار بھی سست پڑ چکی ہے۔ پاکستان شمسی توانائی کے شعبے میں بڑے منصوبے رکھتا ہے۔ حکومت ملک بھر میں سولر بیٹریوں کی فیکٹریوں کے قیام اور الیکٹرک گاڑیوں کے فروغ سمیت متعدد اقدامات پر کام کر رہی ہے۔ تاہم ماہرین کے مطابق ملک ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جہاں آنے والے فیصلے اس کے توانائی کے مستقبل کا تعین کریں گے۔ توانائی کے شعبے کے ماہر داجانہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے سامنے دو ممکنہ راستے ہیں۔ ایک یہ کہ شمسی توانائی اور قومی گرڈ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوئے توانائی کی کامیاب منتقلی کی مثال بن جائیں۔ دوسرا یہ کہ بڑھتی لاگت اور کمزور ہوتا گرڈ ملک کو ایک تنبیہی مثال میں بدل دے، جہاں باقی صارفین پر مالی بوجھ مسلسل بڑھتا چلا جائے۔ ادھر پنجاب کے ایک دیہی علاقے میں رہنے والے شہزاد کے منصوبوں میں کوئی سستی نہیں آئی۔ وہ اپنے گھر کے سولر نظام کو مزید وسعت دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کے بقول، ’ہم مزید 10 سے 15 سولر پینل لگائیں گے اور پھر بیٹریوں اور بیک اپ سسٹم کے ساتھ اسے مکمل کریں گے۔ ہمارا مقصد توانائی کے معاملے میں مکمل خود کفیل ہونا ہے۔‘

☆.....☆

(بقیہ: ری جینر یٹو فارمنگ:

’یوں یہ تمام تر پراجیکٹس اگر آپ ملا کر دیکھیں تو اس ڈھائی ایکڑ کے فارم سے ہم ستر سے اسی لاکھ روپے سالانہ کی زرعی آمدن لے سکتے ہیں۔‘ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح یہ فارم دیگر کسانوں کے لیے ایک ماڈل کا کام کر سکتا ہے۔

چھوٹے کسان اس سے کیسے مستفید ہو سکتے ہیں؟

ریجینریٹو یا قدرتی طریقہ زراعت کو کسی بھی قسم کا کسان اپنا سکتا ہے تاہم ڈاکٹر عظیم اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ خاص طور چھوٹے کسانوں کے اس قسم کا ماڈل زیادہ مستفید ہے کیونکہ وہ کم زمین سے زیادہ آمدن لے سکتے ہیں۔ ’چھوٹے کسان کے حوالے سے اس فارم میں بہت سے فائدے ہیں۔ ہم نے ان چار سالوں میں دیکھا ہے کہ اس فارم پر ان پٹس یعنی کھادوں وغیرہ کا استعمال صفر ہے۔ اسی طرح کیڑے مار دواؤں کا استعمال بھی صفر ہے۔ یہ دو بڑے خرچ ہوتے ہیں کسان کے لیے۔‘ اس کے ساتھ ساتھ اس فارم پر رپلے فارمنگ ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک فصل اٹھا کر ساتھ ہی فوری طور پر دوسری فصل کاشت کر دیتے ہیں۔ ان کے درمیان میں زمین کی تیاری کے لیے وقفہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر محمد عظیم کا کہنا ہے چھوٹے کسان کے لیے یہ طریقہ کار انتہائی مفید ہے۔ ہر علاقے میں وہاں کی آب و ہوا اور مارکیٹ کی دستیابی کو دیکھتے ہوئے فصلوں کی اقسام اور فارم کی منصوبہ بندی میں تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ تاہم ان کے خیال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ منصوبہ بندی سائنسی بنیادوں پر کر لی جائے۔ اس سے کسان اپنے منافع کو بڑھا سکتا ہے۔

☆.....☆

(بقیہ: کیا حجاب یا ہیلمٹ پہننے سے بال جھڑنے لگتے ہیں؟)

انھوں نے بتایا کہ ’اگر ممکن ہو تو کنگھی کے لیے لکڑی کی کنگھی استعمال کرنی چاہیے، کیونکہ پلاسٹک کی کنگھی بالوں کی ساخت کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور سر کی جلد پر موجود حفاظتی تہہ کو متاثر کر سکتی ہے۔‘ ماہرین کا کہنا ہے کہ بال جھڑنے کی کئی بیرونی وجوہات کے علاوہ ذہنی دباؤ بھی اس مسئلے کا ایک اہم سبب ہے۔ ڈاکٹر ایرین کے مطابق ذہنی دباؤ جتنا کم ہوگا، بالوں پر اس کے اثرات بھی اتنے ہی کم ہوں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ ’حجاب یا ہیلمٹ پہننے جیسے بیرونی عوامل سے پیدا ہونے والے دباؤ کے برعکس ذہنی دباؤ ایک ایسی چیز ہے جسے ہم اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔‘

بالوں کے علاج سے متعلق عام غلط فہمیاں

بال جھڑنے کی وجوہات اور ان کے علاج کے بارے میں لوگوں میں کئی طرح کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ بہت سے افراد ڈاکٹر سے رجوع کرنے کے بجائے مختلف ٹوٹکے آزمانے میں اپنا وقت اور پیسہ ضائع کرتے ہیں۔

شیمپو تبدیل کرنے سے بال جھڑنا بند ہو جائیں گے

بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے، لیکن شیمپو کا کام بالوں کو صاف کرنا ہے، انھیں اُگانا نہیں۔ اچھا شیمپو سر کی جلد کو صاف رکھنے اور بال ٹوٹنے سے بچانے میں مدد دے سکتا ہے، لیکن جسم میں ہارمونز یا غذائی اجزا کی کمی جیسے اندرونی مسائل کا علاج نہیں کر سکتا۔



معظم خان

پاکستان میں عدم برداشت، انتہا پسندی اور پُرتشدد واقعات میں تشویش ناک حد تک اضافہ

پاکستانی معاشرے میں ذہنی صحت کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے مطابق پاکستان میں تقریباً 3 کروڑ 24 لاکھ افراد کو ذہنی صحت کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ڈپریشن، اضطراب اور ذہنی دباؤ کے شکار افراد کے لیے مشاورت اور علاج کی سہولتیں ناکافی ہیں

حالیہ برسوں میں پاکستان میں عدم برداشت، انتہا پسندی اور پُرتشدد واقعات میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ سڑکوں پر معمولی جھگڑوں سے لے کر گھریلو تشدد اور ہجوم کی جانب سے قانون ہاتھ میں لینے کے واقعات تک، پورا معاشرہ ایک سنگین نفسیاتی اور سماجی بحران کی زد میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ صورتِ حال محض اتفاقی نہیں، بلکہ اس کے پس منظر میں گہرے سماجی، معاشی اور نفسیاتی عوامل کارفرما ہیں، جنہیں اعداد و شمار کی روشنی میں سمجھنا ناگزیر ہے۔ مختلف تحقیقی اداروں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی رپورٹس بھی پاکستان میں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان اور دیگر آزاد تحقیقی اداروں کے اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ چند برسوں میں چوری کے الزامات پر ہجوم کی جانب سے قانون ہاتھ میں لینے کے واقعات میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ رپورٹس کے مطابق ایسے پُرتشدد واقعات کی شرح ماضی کے مقابلے میں تقریباً 25 فیصد بڑھی ہے۔ ان واقعات میں ملزم کو عدالت کے کٹہرے میں لانے کے بجائے موقع پر ہی سزا دے دی جاتی ہے۔

پاکستانی معاشرے میں ذہنی صحت کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے مطابق پاکستان میں تقریباً 3 کروڑ 24 لاکھ افراد کو ذہنی صحت کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ڈپریشن، اضطراب اور ذہنی دباؤ کے شکار افراد کے لیے مشاورت اور علاج کی سہولتیں ناکافی ہیں۔ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق تقریباً 24 کروڑ کی آبادی والے ملک میں مستند ماہرینِ نفسیات کی شرح محض 0.19 ہے۔ ذہنی صحت سے متعلق ضروریات کے مقابلے میں یہ تعداد انتہائی کم ہے۔ محتاط اندازوں کے مطابق ملک کی مجموعی آبادی کا 24.8 فیصد ڈپریشن اور اضطراب کا شکار ہے، جب کہ طلبہ میں یہ تناسب 51.1 فیصد بتایا جاتا ہے۔ اس تناظر میں تشویش ناک امر یہ ہے کہ حکومت صحت کے مجموعی بجٹ کا محض 0.5 فیصد ذہنی صحت کی بحالی کے لیے مختص کرتی ہے۔

ایسی صورتِ حال میں اگر ملک میں خودکشی اور خودسوزی جیسے افسوس ناک واقعات میں اضافے کی اطلاعات سامنے آ رہی ہیں تو یہ غیر متوقع نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر موضوع الگ توجہ اور تحقیق کا متقاضی ہے۔ تاہم سردست زیرِ بحث معاملہ ہجوم کے پُرتشدد رویّے اور ایذا رسانی کے واقعات میں اضافے کا رجحان ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ذہنی دباؤ کا شکار بعض افراد معمولی بات پر بھی شدید ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جب معاشرے میں لوٹ مار اور قتل جیسے جرائم کے واقعات بڑھ رہے ہوں اور لوگ ڈاکوؤں کے ہاتھوں یرغمال بننے لگیں تو عدم تحفظ کا احساس بھی شدت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ذہنی دباؤ بجائے خود تشدد کا جواز نہیں، اور نہ ہی ہر ذہنی مسئلے کا شکار شخص پُرتشدد رویہ اختیار کرتا ہے۔

اگر اس پُرتشدد رجحان کو روکنے کے لیے فوری اور موثر اقدامات نہ کیے گئے تو معاشرہ مزید بدامنی اور انتشار کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے حکومت کو نظامِ عدل میں اصلاحات لانی چاہئیں، تاکہ جرائم کے مقدمات کی منصفانہ اور بروقت سماعت ہو اور مجرموں کو قانون کے مطابق سزا مل سکے۔ اس معاملے میں عدل فراہم کرنے والے افراد اور اداروں پر بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس ذمہ داری کا احساس ہر اُس شخص کو کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے رواداری، امن اور قانون کے احترام کو فروغ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ معاشی استحکام، ذہنی صحت سے متعلق آگاہی اور علاج و مشاورت کے مراکز کا قیام بھی اس بحران پر قابو پانے کے لیے ناگزیر ہے۔

ایذا رسانی کو تفریح سمجھنا اس صورتِ حال کا سب سے المناک پہلو ہے۔ ایسے بے شمار واقعات کی وائرل ہونے والی ویڈیوز میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کسی لٹیرے کو پکڑ کر تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہوتا ہے، جب کہ ہجوم میں موجود ہر عمر کے افراد، حتیٰ کہ بچے بھی اس منظر سے محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ پورے ہجوم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جو تشدد کرنے والوں کو روکنے یا قانون ہاتھ میں لینے سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ ایسے مواقع پر احساسِ جواب دہی مفقود دکھائی دیتا ہے، حالاں کہ ہمارے اسلاف کی تاریخ اس کی روشن مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ کس طرح مظلوم کی حمایت اور ظالم کو روکنے کو اپنی ذمہ داری سمجھا جاتا تھا۔

یہ درست ہے کہ مسائل بڑھ گئے ہیں، ظالم طاقت ور ہو گئے ہیں، حقوق غصب کرنے والے آزادانہ گھوم رہے ہیں، نظامِ انصاف کمزور پڑ گیا ہے اور قانون کے بعض محافظوں پر بھی جرائم کی سرپرستی کے الزامات سامنے آتے رہتے ہیں۔ شریف شہری کو اکثر نقصان برداشت کر کے خاموش رہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بحیثیت قوم اجتماعی بے حسی اور لاتعلقی کی ایسی مثالیں قائم کی ہیں کہ برائیوں کو اُس وقت تک نظر انداز کرتے رہے جب تک ان کے اثرات براہِ راست ہماری زندگیوں تک نہیں پہنچے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق نہ ہم نے ظالم کا ہاتھ روکا اور نہ ہی نیکی کی تلقین اور برائی سے روکنے کی اپنی ذمہ داری پوری کی۔ نتیجتاً معاشرتی جرائم ہماری پہچان بنتے جا رہے ہیں۔

امن و سلامتی کے دین کے ماننے والے آج خود امن و سلامتی کو ترس رہے ہیں۔ ہماری معاشرت تیزی سے ایسی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے جہاں طاقت ور کا قانون چلتا ہے، اسی کی اخلاقیات کو رواج ملتا ہے، کشت و خون عام ہو جاتا ہے اور لوٹ مار ایک تماشے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے ماحول میں برائیوں پر مشتمل نظام کے خلاف خاموشی اختیار کرنے اور اس کی اصلاح کے لیے جدوجہد نہ کرنے کے نتائج بالآخر پورے معاشرے کو بھگتنا پڑتے ہیں۔

اگر ہم لاکھوں انسانوں کی قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی اس عظیم نعمت، یعنی پاکستان کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں خود احتسابی کے ساتھ نیکی اور حق کا راستہ اختیار کرنا ہوگا اور ظلم و ناانصافی کے نظام کو پُرامن، اجتماعی اور موثر جدوجہد کے ذریعے بدلنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ بصورتِ دیگر ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں..... اور ہماری نسلیں اذیت پسندی اور تشدد کے اس ماحول میں اپنی دنیا اور آخرت دونوں تباہ کر لیں گی۔





سڑکوں پر معمولی جھگڑوں سے لے کر گھریلو تشدد اور ہجوم کی جانب سے قانون ہاتھ میں لینے کے واقعات تک، پورا معاشرہ ایک سنگین نفسیاتی اور سماجی بحران کی زد میں دکھائی دیتا ہے

پاکستانی معاشرے میں ذہنی صحت کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے مطابق پاکستان میں تقریباً 3 کروڑ 24 لاکھ افراد کو ذہنی صحت کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ڈپریشن، اضطراب اور ذہنی دباؤ کے شکار افراد کیلئے مشاورت اور علاج کی سہولتیں ناکافی ہیں

